ہفت روزہ

ندائے خلافت

۱۵ / نومبر ۱۹۹۳ء

☆ میں اول و آخر پاکستانی ہوں: امیر محترم کی ایک یادگار تحریر
☆ تنظیم اسلامی کا سالانہ اجتماع: ایک ہم سفر کے تاثرات
☆ پاکستان اسلامی فرنٹ کی ناکامی کے اخلاقی اسباب

تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت پاکستان کا مستقل موقف

۵۶ء سے میرا مستقل موقف یہ رہا ہے' اور آج بھی ہے' کہ اگرچہ پاکستان کی سالمیت اور بقاء کے لئے یہاں جمہوری' سیاسی اور انتخابی عمل کا جاری رہنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی انسان کے زندہ رہنے کے لئے ہوا پانی اور غذا کی فراہمی۔ لیکن پاکستان کے استحکام اور اس کا باعزت اور باوقار وجود صرف اسلام کے سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام یعنی دین حق کے نظام عدل اجتماعی کے قیام میں مضمر ہے---اور اس کے قیام کی جانب کوئی پیشقدمی انتخابی عمل میں شریک ہو کر ممکن نہیں' بلکہ صرف اور صرف انقلابی عمل کے ذریعے ممکن ہے۔ تاہم انتخابات میں حصہ لینے کو میں نے نہ کبھی حرام قرار دیا ہے نہ مکروہ تحریمی' بلکہ جو مذہبی جماعتیں اس میدان میں سرگرمی پر مصر ہی ہوں ان کو ہمیشہ یہ مشورہ دیا ہے کہ "یا چناں کن یا چنیں!" کے مصداق یا تو سب مل کر ایک جھنڈے تلے اور ایک پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لیں' یا پھر پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ ورنہ ۷۰ء کی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہے گی۔ (اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ یہ اندازہ مجھے بھی نہیں تھا کہ اس بار تاریخ کا فیصلہ اس قدر بے رحمانہ "ہو گا جتنا بالفعل ہوا۔)

(ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک تحریر سے اقتباس جو زیر نظر شمارے میں شامل ہے)

قیمت ۵ روپے

ناظم اعلیٰ کا دورۂ راولپنڈی

ایک وقت وہ بھی تھا جب امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ پیغام حق پہنچانے کے لئے تن تنہا ملک کے طول و عرض کے دورے کیا کرتے تھے۔ انتخابی سیاست اور جمہوریت کی اس پر تعفن فضا میں انقلاب اور قرآن کی بات پر کان دھرنے کو کوئی تیار نہ تھا۔ رفتہ رفتہ نور توحید پھیلتا گیا اور کاروان بنتا گیا۔ تا آنکہ انتخابی سیاست سے مایوس ہو کر انقلابی جدوجہد کے قافلے میں میجر جنرل (ریٹائرڈ) ایم ایچ انصاری صاحب شریک ہوئے۔ ہماری دلی خواہش تھی کہ عسکری سرزمین یعنی راولپنڈی میں پاک فوج کے سپاہی کی کھری کھری باتیں سنی جائیں۔ چنانچہ ۱۵ اکتوبر ۹۳ء کو اس کا اہتمام ہو ہی گیا' جس کا ایک مدت سے انتظار تھا۔

۱۴ اکتوبر کو موصوف نے تین بجے اسلام آباد ایئر پورٹ پر قدم رنجہ فرمایا۔ ابتدائی معاملات سے فارغ ہونے کے بعد شام کے وقت ظفرالامین صاحب کے مکان پر ایک عشائیہ کا اہتمام کیا گیا' جس میں اسلام آباد کے علمی اور کاروباری حلقہ سے وابستگان کو بھی مدعو کیا گیا تاکہ وہ بھی جنرل صاحب کے خیالات سے آگاہی حاصل کریں۔ نماز مغرب کے بعد سے شروع ہو کر یہ محفل رات دس بجے تک جاری رہی' جس میں ملکی حالات اور امت مسلمہ کی زبوں حالی پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ ڈاکٹر قمر الزمان صاحب نے بوسنیا کے مسلمانوں کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ بیان کئے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف بوسنیا کی جنگ میں حصہ بھی لے چکے ہیں اور آج کل بوسنیا کے لئے مالی امداد کے لئے کوشاں ہیں۔

۱۵ اکتوبر یعنی دوسرے دن صبح دس بجے خلافت کمیٹی کے اراکین کی میٹنگ میں جنرل صاحب نے شرکت فرمائی۔ شرکا سے تحریک خلافت پاکستان کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے مشورے طلب کئے گئے۔ راولپنڈی میں جس نہج پر کام ہو رہا ہے راقم نے اس کی بریفنگ دی۔ بعد میں جنرل صاحب نے حاضرین کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔

بعد ازاں جنرل صاحب نے آئی ۱۰ کی مسجد زہرا میں اجتماع جمعہ سے خطاب فرمایا۔ یہاں موضوع گفتگو "نبی اکرم ﷺ ہمارے تعلق کی بنیادیں" تھا۔ اگرچہ خطاب جمعہ کا پروگرام صبح کے وقت ہی بنا تاہم مقامی خطیب صاحب کی مساعی جمیلہ سے حاضری کافی حوصلہ افزا تھی۔ رفقاء نے بھی فوری طور پر اناؤنسمنٹ کا انتظام کر کے آئی ۱۰ کی حد تک خطاب جمعہ کی خوب تشہیر کی' جو نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔۔ نماز جمعہ کے بعد خلافت کی برکات کا ایک ورقہ بھی تقسیم کیا گیا اور البدر ہوٹل میں شام کے جلسہ کا اعلان بھی ہوا' جس کے لئے اس جگہ سے شرکاء کو لانے کے لئے ایک بس اور دیگر ٹرانسپورٹ کا انتظام کرنا پڑا۔

بعد از نماز مغرب البدر ہوٹل نزد کمیٹی چوک کے وسیع و عریض ہال میں جلسہ عام کا اہتمام تھا۔ اگرچہ حاضری کی زیادہ توقع تو نہ تھی' کیونکہ حالیہ الیکشن میں قوم نے دینی جماعتوں سے جس طرح اظہار بیزاری کیا وہ کوئی راز نہیں' پھر راقم سالانہ اجتماع اور مجلس عاملہ کی میٹنگ وغیرہ میں اکثر لاہور رہا۔ میرے نائب خالد محمود عباسی ۱۵ تا ۲۲ اکتوبر مبتدی تربیت گاہ کے سلسلے میں مصروف رہے اور ہر ماہ کا پہلا ہفتہ وہ آزاد کشمیر کے دورے پر رہتے ہیں۔ مقامی امیر غلام مرتضیٰ اعوان اور رفقائے راولپنڈی بھی معمول کے پروگراموں کے علاوہ محترم ڈاکٹر عارف رشید کے ماہانہ درس قرآن اور خلافت ریلی کی تیاری میں مصروف رہے' الیکشن کی چھٹیاں اس پر مستزاد تھیں۔ تاہم ان تمام موانعات و مشکلات کے باوجود اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید و نصرت سے ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی اور مزید یہ کہ سامعین نے انتہائی انہماک سے ہماری باتیں سنیں۔ جلسے کا آغاز نماز مغرب کے فوراً بعد حافظ محمد اقبال صاحب کی تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ انہوں نے سورہ نور کی آیات ۵۴ تا ۵۶ کی تلاوت کی' راقم نے تحریک خلافت اور جنرل صاحب کا مختصر تعارف کرایا۔ اس کے بعد سیکرٹری تحریک خلافت محترم عبدالرزاق نے خلافت کے خدوخال پر مفصل گفتگو فرمائی۔ انہوں نے بتایا کہ ہم نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا ہے؟ اس کی پشت پر قرآن و احادیث سے کیا دلائل ملتے ہیں؟

بعد ازاں جنرل صاحب نے مائیک سنبھالا اور کسی لگی لپٹی کے بغیر بتایا کہ میں نے فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد جمعیت العلمائے پاکستان میں شرکت کی۔ قومی اسمبلی کا ممبر بھی بنا' لیکن جب محسوس ہوا کہ الیکشنی سیاست میں اسلام کا بھلا جو ہونا ہے وہ تو کیا ہو گا الٹا انسان کا اپنا کردار بھی داغ دار ہو جاتا ہے۔ ایسے ایسے اعمال کرنے پڑتے ہیں جو کسی سنجیدہ اور باوقار شخص کے شایان شان نہیں ہوتے۔ چنانچہ میں نے اس دلدل سے نکلنے کا فیصلہ کیا اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے لٹریچر کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت میں شمولیت اختیار کر لی۔ محترم جنرل صاحب نے عوام سے درخواست کی کہ اگر آپ خلافت کے پیغام کو صحیح سمجھتے ہیں تو اس کی گواہی تو کم از کم دے دو۔ اس کے گواہ تو بن جاؤ۔ وہ سپاہی جس کی جوانی مختلف محاذوں پر پاکستان کے پرچم کو سربلند کرنے میں گزری آج خلافت کے علم کو بلند کرتے ہوئے بہت حسین نظر آ رہا تھا۔

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
آتی ہے کوہ طور سے اب بھی صدائے لاتخف

مرتب : شمس الحق اعوان ناظم حلقہ راولپنڈی

اندرون سندھ سے ایک خط اور اس کا جواب

زخمی دلوں پر مرہم رکھنے کا یہی طریقہ ہے

محترمی و مکرمی جناب محمد نسیم الدین صاحب

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

اللہ تعالیٰ آپ کو ایمان و صحت کی بہترین حالت میں رکھے۔

احوال آنکہ آپ کا مورخہ ۱۹ ستمبر ۹۳ء کا ارسال

(باقی اندرونی سرورق کے دوسری جانب)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

○

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

جلد ۲ شمارہ ۴۵

۱۵ نومبر ۱۹۹۳ء

20

مدیر

اقتدار احمد

معاون مدیر

حافظ عاکف سعید

○

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

مرکزی دفتر: ۶۷۔اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

مقامِ اشاعت

۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: ۸۵۶۰۰۳

○

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری

مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ، لاہور

○

قیمت فی پرچہ: ۵/- روپے

سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) ۱۰۰/- روپے

○

زرتعاون برائے بیرون پاکستان

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۱۰ امریکی ڈالر

مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— ۸ " "

افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۱۲ " "

شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— ۱۶ " "

تجدید ایمان' توبہ اور تجدید عہد

قوم رسول ہاشمی ﷺ یعنی امت مرحومہ کے جسد ملی پر داغوں کی بہار دیدنی ہے اور زخموں کا شمار حساب کتاب سے باہر' اس پر مستزاد پاکستان کے مسلمانوں کو درد سر اور درد جگر سے بھی بیک وقت پالا پڑا ہوا ہے۔ بوسنیا سے اٹھنے والی درد کی ٹیس میں فلسطین کا کرب پہلے بھی شامل تھا' اب صومالیہ کے اضطراب نے اسے دہ چند کر دیا ہے جو صاف نظر آتا ہے کہ بالآخر سوڈان میں احیائے اسلام کی کوششوں پر بھی اثر انداز ہو گا۔ شمال میں افغانستان کے زخم سے پھر خون رسنا شروع ہو گیا ہے اور پہلو میں وادی کشمیر لہو رنگ ہے' اس لالہ زار میں ہر طرف آگ بھڑک اٹھی ہے۔ حضرت بل کی درگاہ ہی نہیں' پوری آبادی محاصرے میں ہے اور برسہابرس سے بھارتی درندوں کو جان و مال اور عزت و آبرو کا خراج ادا کر رہی ہے۔ افغانستان ہمارے لئے درد سر اور کشمیر گویا درد جگر ہے۔

افغانستان سے دنیا کے چوہدریوں کی دلچسپی اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے کیونکہ روس کا کریا کرم تو ہو ہی چکا' اسے اپنے حال پر چھوڑ دینے والے آزمتیوں نے وسطی ایشیا کی نو آزاد ریاستوں تک پہنچنے کے بھی نسبتاً زیادہ "قابل اعتماد" راستے نکال لئے ہیں البتہ کشمیر چار عشروں کے سفاکانہ تغافل کے بعد اب اچانک عالمی التفات کا مستحق قرار پایا ہے تو اس لئے کہ اگرچہ کشمیر کے مظلوم مسلمانوں نے بھی اپنے خون سے سرفروشی کی چونکا دینے والی داستانیں رقم کر کے دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا ہے تاہم اصل علت اس کی یہ ہے کہ "نیو ورلڈ آرڈر" کے سرپنچ یعنی کرۂ ارضی کی سپریم پاور' امریکہ کی مصلحت اب اس زخم کا منہ بند کر دینے میں ہے۔ مسئلہ فلسطین کو وہ بڑے عزاز و اکرام کے ساتھ غزہ کی پٹی میں دفن کر کے کشمیریوں کی غم خواری میں سعی فرمانے کے لئے حال ہی میں فارغ ہوا ہے۔ اب مسئلہ کشمیر کا بھی کوئی ایسا "حل" سامنے آئے گا۔ جو پاکستان اور بھارت کے لئے بھی کسی نہ کسی درجے میں قابل قبول ہو اور امریکہ کو وادی میں سر چھپانے کی جگہ بھی مہیا کر دے تاکہ چین اور وسط ایشیا کے حساس علاقے پر نظر رکھنا اس کے لئے ممکن نہ ہو سکے۔ امریکی صدر بل کلنٹن کے پیٹ میں کشمیر کا مروڑ اٹھا اور امریکی محکمہ امور خارجہ کو وہاں حقوق انسانی کی پامالی کے احساس نے ڈسنا شروع کیا ہے تو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ پاکستان اور بھارت میں تعلقات کو معمول پر لانا مقصود ہے جس کے بعد پاکستان کو اپنے ایٹمی پروگرام پر فاتحہ پڑھنے اور دفاعی افواج میں کمی کرنے پر زیادہ آسانی سے آمادہ کیا جا سکے گا تاکہ عراق کے شتربے مہار اور صدام حسین اور اس کی سپاہ کو نکیل دینے کے بعد مسلمانان عالم کا بازوئے شمشیرزن بالکل شل ہو کر رہ جائے اور "اسلامی بم" کا وہ کانٹا بھی نکل جائے جو فرنگ اور صیہونیت کے دل میں کھٹکتا ہے۔ ہمارا معاملہ اپنی جگہ کہ عشروں پر محیط سہل انگاری اور فرض ناشناسی کی سزا تو بطور مکافات عمل ہمیں مل کر رہے گی کہ فطرت کبھی قوموں کی خطاؤں کو معاف نہیں کیا کرتی' دکھ اس بات کا ہے کہ کشمیری مسلمانوں کی قربانیاں بھی اسی طرح رائیگاں جاتی نظر آتی ہیں جیسے فلسطینوں کی ہوئیں۔

کرۂ ارضی پر پھیلے ہوئے سوا ارب سے زیادہ مسلمانوں کو اور بالخصوص پاکستان کی کلمہ گو آبادی کو اپنے مسائل کے حل اور مشکلات کے ازالے کے لئے ہر سطح پر اور ہر نوع کی کوششیں کرنی چاہئیں۔ ہم عالم اسباب میں بستے ہیں جہاں حصول نتائج کے لئے روحانی سہاروں کے علاوہ مادی عوامل کی کارفرمائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کارواں کے دل میں احساس زیادہ پیدا ہو اور انفرادی طور پر بھی مسلمان اپنی ملت کے مقدر کا ستارہ ہونے کے ناطے اس کی کسک محسوس کرے تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ان بندوں کے پاس مادی وسائل کی بھی کمی نہیں جنہیں بھرپور انداز میں استعمال کرنا البتہ صرف اس وقت ممکن ہو گا۔ جب مسلمان اقوام عالم کو ہر جگہ مخلص اور بے لوث قومی قیادت میسر آ جائے۔ اس تدبیر کے ساتھ بلکہ اس سے بڑھ کر احتیاج ہمیں جسد ملت میں روحانی قوت پیدا کرنے کی ہے جو افراد کے قلوب میں ایمان کے جاگزین ہو جانے سے حاصل ہوتی ہے اور ایمان کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ یہ نسخہ کیمیا ہماری جانب سے مجرمانہ ناقدری کا شکار ہے اور شاید ہم پر مردنی طاری ہی اس وجہ سے ہے کہ ہم نے ایک زندہ کتاب سے مہجوری اختیار کی جو ہمیں زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ اس خیال کو عام کرنا اس رجوع الی القرآن کا اساسی مقصد ہے جس کی بنیاد پر تنظیم اسلامی تجدید ایمان' توبہ اور تجدید عہد کی دعوت دے رہی ہے۔

قوم کے دانا و بینا بھی خواہ چارہ جوئی میں مصروف اور نئے سے نئے نسخوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اے اللہ! ان کے دلوں میں اس یقین کی آبیاری فرما کہ یہاں اصل ضرورت توبہ کی منادی کی ہے اور ایمان کے حصول کے لئے قرآن کی طرف رجوع کی!○○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الہدیٰ

سورۃ البقرہ
(آیات ۱۷۲-۱۷۳)

حافظ عاکف سعید

اے ایمان والو' کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں کو جو ہم نے تم کو بخشی ہیں اور اللہ ہی کے شکر گزار بنو اگر تم اسی کی بندگی کرنے والے ہو○

(کہ اے مسلمانو' یہ مشرکین اگر شیطان کی پیروی میں بعض پاکیزہ چیزوں کو حرام اور بعض خبیث اور ناپاک اشیاء کو حلال ٹھہرانے پر تلے ہوئے ہیں اور اپنی مشرکانہ بدعات پر اڑے رہنا چاہتے ہیں تو تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور ان کے بے بنیاد اعتراضات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اللہ کی عطا کردہ تمام پاکیزہ چیزوں کو جزو طعام بنانے میں ہرگز جھجک کا مظاہرہ نہ کرو بلکہ اللہ کا شکر بجالاؤ کہ اس نے تمام پاکیزہ اور طیب چیزوں کو تمہارے لئے حلال ٹھہرایا ہے۔ اللہ کے عطا کردہ پاکیزہ رزق کو اپنی مشرکانہ رسوم کے تحت حرام ٹھہرانا اللہ کی بندگی کے بھی منافی ہے اور اس کی شکر گزاری کے تقاضوں کے بھی یکسر خلاف ہے!)

اس نے تو بس تم پر مردار کو حرام کیا ہے اور خون کو اور سور کے گوشت کو اور غیر اللہ کے نام کے ذبیحے کو'

(کہ مشرکین عرب نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت چوپایوں میں سے بعض کو جو حرام قرار دیا ہے تو یہ ایک بالکل بے بنیاد بات ہے' ملت ابراھیمؑ کی طرف اس کی نسبت بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ ہاں ہر قسم کے مردار اور خون کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے---- بجز مچھلی اور ٹڈی کے' اور کلیجی اور تلی کے' کہ جن کی حلت احادیث صحیحہ سے ثابت ہے---- اور سور کے گوشت کو بھی حرام ٹھہرایا ہے کہ ان چیزوں کا نجس اور ناپاک ہونا بالکل ظاہر و باہر ہے' اور ہر اس جانور کو بھی حرام ٹھہرایا ہے کہ جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو یا اس جانور کو غیر اللہ کی نذر کر کے ان کے تقرب یا رضا جوئی کی نیت سے ذبح کیا گیا ہو اور اس طرح اسے شرک کی معنوی نجاست سے آلودہ کر لیا گیا ہو' اس لئے کہ شرک وہ سب سے بڑی عقلی اور باطنی نجاست ہے کہ کسی بھی اعتبار سے اس کی چھوت اگر کسی پاک چیز کو لگ جائے تو وہ چیز بھی ناپاک ہو جاتی ہے!)

پھر جو کوئی مجبور ہو جائے بشرطیکہ نہ وہ طالب لذت ہو اور نہ حد سے آگے بڑھنے والا ہو تو اس کے لئے کوئی گناہ نہیں ہے۔ اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے○

(ہاں' اگر کوئی شخص بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو جائے اور اس پر اضطراری حالت طاری ہو جائے تو وہ اپنی جان بچانے کے لئے حرام اشیاء کو بھی اپنے استعمال میں لا سکتا ہے' بشرطیکہ یہ اضطرار واقعی ہو۔ حرام کی چاہت اور چٹخارے کے حصول کا اس معاملے میں دخل نہ ہو اور حرام کا استعمال بس اسی قدر ہو جتنا کہ جان بچانے کے لئے ضروری سمجھا جائے' شکم سیری پیش نظر نہ ہو۔ ان شرائط کے ساتھ اگر کوئی حالت مجبوری میں حرام سے فائدہ اٹھاتا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اللہ بخشنے والا بھی ہے اور رحم فرمانے والا بھی!)

جوامع الکلم

صدقہ و خیرات کرنے سے مال میں کمی واقع نہیں ہوتی' عفو و درگزر سے کام لینے والے بندے کی عزت میں اللہ اضافہ فرماتا ہے اور جو شخص اللہ کی خاطر تواضع اور انکساری اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو رفعت عطا فرماتا ہے

(کہ صدقہ و خیرات کرنے والے کو یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس کا مال کم ہو جائے گا اور اس کی ضروریات زندگی پوری نہ ہو سکیں گی' وہ مطمئن رہے اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات کی فراہمی کا بھرپور بندوبست فرمائے گا' دوسرے سے بدلہ لے کر انتقام کی آگ بجھانے کی بجائے اسے معاف کرنے والا شخص ہرگز اس میں اپنی سبکی محسوس نہ کرے بلکہ وہ اطمینان رکھے' اس کے اس عمل کے صلے میں اللہ اس کی عزت اور وقار میں اضافہ فرمائے گا' اسی طرح اللہ کی رضا کے لئے تواضع اور انکساری اختیار کرنے والے کو بھی نبی اکرم ﷺ نے یہ بشارت دی ہے کہ اس کی یہ منکسر المزاجی ہرگز اس کی تحقیر کا باعث نہیں بنے گی بلکہ اللہ اسے رفعت و سربلندی عطا فرمائے گا!) (صحیح مسلم بروایت حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ)

پیپلزپارٹی کی دشمنی کو "دین" بنالیا گیا تھا

پاکستان اسلامی فرنٹ کی ناکامی کے اخلاقی اسباب

موسیقی اور بھنگڑا نواز شریف کی حمایت میں ہوتا تو جائز تھا

عبدالکریم عابد

جناب خرم مراد کو جماعت اسلامی میں ایک اہم فکری مقام حاصل ہے۔ بعض لوگ انھیں 'اسلامک فرنٹ' کا اصل منصوبہ ساز کہتے ہیں' ایسا نہ ہو تب بھی جماعت میں وہ فکری قیادت اور نظریاتی اساس فراہم کرنے کے سلسلہ میں اہمیت رکھتے ہیں۔ ترجمان القرآن کے اشارات پہلے محترم نعیم صدیقی لکھا کرتے تھے اور اب خرم مراد صاحب لکھتے ہیں اور ان کی اس تحریر کو ایک نظریاتی دستاویز کی حیثیت بھی حاصل رہتی ہے۔ نومبر کے ترجمان میں انھوں نے 'اسلامک فرنٹ کی ناکامی کے اخلاقی اسباب' کے ضمن میں لکھا ہے:

"کامیابی کیلئے لازمی وسیلہ مومنین کا ایسا گروہ ہے جن کے دل الفت کے رشتے میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوں' جو سمع طاعت اور نظم وضبط کے پابند ہوں' جو بنیان مرصوص ہوں۔ اس پہلو سے اپنا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر شکست نہ ہوتی تو تعجب کی بات ہوتی۔ سب نہیں' اکثریت بھی نہیں' لیکن ایک خاصی معقول تعداد جس میں اکابر بھی ہیں اور اصاغر بھی' پرانے تربیت یافتہ بھی ہیں اور نو وارد بھی' ان سارے احکام کی خلاف ورزی میں ملوث رہی ہے۔ یہ کیفیت کوئی آج کی بات نہیں کہ جو موجودہ امارت' پاسبان اور فرنٹ جیسے مسائل کی وجہ سے ہو' پہلے سمع وطاعت اور نظم وضبط تو رہا ہے' احتساب اور گرفت میں پکڑنے کا رواج بھی رہا ہے مگر محبت والفت کی ہمیشہ کمی رہی ہے۔ اب ایک عرصہ سے مثالی نظم بھی ہاتھ سے جا رہا ہے لیکن پہلے بھی کسی جگہ جب اختلاف ہو جاتا' افراد کے درمیان ذاتی ہو' اصول واحکام کی تعبیر میں ہو' تدابیر ومصالح کے تعین میں ہو' پھر دیکھئے دل کس طرح پھٹ جاتے تھے' مشہور زمانہ نظم وضبط کے بندھن بھی ٹوٹ جاتے تھے' لب ولہجہ بدل جاتا تھا' سخت سے سخت الفاظ استعمال کرنے سے دریغ نہیں ہوتا تھا"۔

خرم مراد صاحب نے شکایت کی ہے کہ موسیقی' تصویر' بھنگڑہ تو صغیرہ گناہ ہیں لیکن گروہ بندی' نجوئی' بہتان' افترا' بدظنی' بلا تحقیق الزامات' غیبت کبیرہ گناہ ہیں۔ ان کی وجہ سے عاقبت تباہ ہو سکتی ہے۔ پھر کیا یہ سب کام نہ کئے گئے؟۔ خرم صاحب کا تجزیہ یقیناً صحیح ہو گا۔ وہ جماعت کی داخلی صورت حال کا پورا علم رکھتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ نوبت یہاں تک کیسے آئی۔

میرے خیال میں سیاست کے محاذ پر جو جماعتیں سرگرم ہوتی ہیں' ان کی ضرورت یہ ہے کہ وہ افراد میں اپنے پروگرام کے بارے میں شرح صدر پیدا کریں' اس کے لئے انھیں اپنے ارکان اور حامیوں کی سیاسی تعلیم کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے تاکہ فکر ونظر کے لحاظ سے یکساں سوچ کا ارتقاء ہو سکے۔ یہ کام صرف ڈسپلن کے نام پر نہیں ہو سکتا' اس کیلئے مسائل پر کھل کر گفتگو' مختلف زاویہ ہائے نگاہ میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش اور اختلاف کرنے والوں کی بات سننے سمجھنے کا کلچر ہونا چاہئے۔ جہاں اس ضرورت سے آنکھ چرائی جائے گی اور ڈسپلن کی لاٹھی سے سب کو ہانکا جائے گا وہاں ظاہری طور پر تو سب ٹھیک رہے گا مگر اندر ہی اندر باتیں ہوتی رہیں گی۔ پھر یہ ہے کہ اگر فکر ونظر میں یکسانیت پیدا کرنے کیلئے جس فکری کام کی ضرورت ہو اس کو چھوڑ کر محض نعروں پر اکتفا کیا جائے تو رفتہ رفتہ فکری اختلاف بھی پیدا ہو گا اور بڑھتا چلا جائے گا۔ یہ بھی ضرور رہا ہے کہ جماعتی پالیسیوں کو اس کے عہدیدار حسب منشا شکل دینے کیلئے بالکل یکطرفہ روش اختیار نہ کریں۔ میاں طفیل محمد کے زمانے میں کراچی اور خود لاہور کے بھی کافی لوگوں کو یہ شکایت رہی کہ ہر فیصلہ توڑ مروڑ کر ضیاء الحق کی حمایت میں بنالیا جاتا تھا اور جب اس طرح ہو تو رسمی اتحاد چل سکتا ہے' اتحاد کی حقیقی روح باقی نہیں رہتی اور جن کبائر کا خرم صاحب نے تذکرہ کیا ہے وہ سر اٹھاتے ہیں۔ خرم مراد صاحب نے ایک اور بات کا تذکرہ کیا ہے کہ عدل وقسط کی راہ سے ہم ہٹ گئے حالانکہ ہمیں اپنے بدترین دشمن کے ساتھ بھی بے لاگ عدل پر کاربند رہنے کی تاکید کی گئی تھی مگر ہوا کیا' خرم صاحب کہتے ہیں:

"جن سے ہمارا سیاسی اختلاف ہوا ہم نے ان کے خلاف بات کرنے میں عدل واحسان کے تقاضے یاد نہ رکھے۔ ہم بھی بلا ثبوت مخالفین کو مدار قرار دیتے رہے اور ان پر ہر نوع کے اتہامات عائد کرتے رہے۔ ان پر ظلم ہوا' ہم نے اپنے سیاسی مفاد میں اس کام کے

عبدالکریم صاحب نے اپنے کالم سے اس بار تجزیے سے زیادہ جماعت اسلامی کے موقف کی وضاحت کا کام لیا ہے تاہم یہ بھی ایک ضرورت تھی جو پوری ہو گئی۔ "ندائے خلافت" میں حالیہ انتخابات کے حوالے سے جماعت اسلامی (یا پاکستان اسلامی فرنٹ) کے بارے میں بظاہر مخالفانہ انداز میں خاصا کچھ لکھا گیا اور توازن برقرار رکھنے کے لئے مناسب تھا کہ جماعت کے جناب خرم مراد جیسے دانشور کے خیالات بھی ہم اپنے قارئین تک پہنچا دیں جن کی تحریر کا عابد صاحب نے خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ (ادارہ)

خلاف زبان نہ کھولی۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت کو گرانے کیلئے نواز شریف نے ہارس ٹریڈنگ کی تو ہم خاموشی اختیار کئے رہے۔ ۸۸ء اور ۹۰ء میں نگران حکومتوں نے اپنا اقتدار اور اپنے وسائل کھلم کھلا ایک جماعت کو کامیاب کرانے کیلئے استعمال کئے' ہم نے کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی"

ملک کی ایک بدقسمتی یہ تھی کہ لوگوں کو پروپیپلز پارٹی اور اینٹی پیپلز پارٹی کی گروہ بندی میں مبتلا کر دیا گیا اور یہ گروہ بندی جو عداوت میں بدل گئی' خالص جاہلانہ نوعیت کی تھی۔ اس کا تعلق اسلام سے نہیں' جاہلیت کی عصبیت سے تھا۔ اس پر خرم صاحب لکھتے ہیں کہ یہ ہماری غلطی تھی۔ وہ لکھتے ہیں

"پیپلز پارٹی کے خلاف سارے الزامات تسلیم' لیکن کسی پارٹی کی دشمنی کو ایمان و عقیدہ کا جزو بنا لینا خلاف ایمان ہے اور اس کے خلاف نفرت کا زہر گھول گھول کر پلانا دعوت کے مقام و اخلاق کے منافی۔ بلکہ یہ سیاسی حکمت کے بھی منافی ہے کہ ملک کی بڑی سیاسی جماعت کے ساتھ مستقل نفرت و عداوت کا تعلق ہو۔ ہم یہ کام بھی کرتے رہے یہاں تک کہ ایک دن ایسا آیا کہ جب ہم نے اپنے ووٹ بنک کو سیاسی دشمنی اور دوستی سے بالاتر ہو کر اصول اور مفاد ملی میں اپنا ساتھ دینے کے لئے پکارا تو پیپلز پارٹی کی دشمنی میں خود جماعت اسلامی کے ووٹر نے جماعت اسلامی کو ووٹ دینے سے انکار کیا۔"

خرم صاحب کا ایک اور تجزیہ ان کی حق گوئی اور دانشوری کا مظہر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر جماعت اسلامی اپنے پروگرام اور تشخص کی بنیاد پر الیکشن لڑ رہی ہوتی تو بھی نتیجہ یہی نکلتا۔ اگر اسلامک فرنٹ نہ ہوتا' اگر پاسبان اور اس کے کام نہ ہوتے' اگر انتخابی مہم میں متانت سے گرے ہوئے انداز و اطوار اور پروگرام نہ ہوتے' اگر ہم بالکل ۱۹۷۰ء کے انداز میں مہم چلاتے تب بھی نتائج آج یا ۱۹۷۰ء سے مختلف نہ ہوتے۔ ۱۹۷۷ء' ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۰ء میں ہمارے ان ووٹرز کے دل جنہوں نے آج ان سارے الزامات کے بہانے نواز شریف کو ووٹ دیئے' اس بات سے شق نہ ہوئے کہ اب ان کے ہاتھوں میں کلمہ طیبہ کی بجائے نو ستاروں کا پرچم ہے جن میں بیگم ولی خاں اور اصغر خاں بھی شامل ہیں۔ یہ بات ان کے دین و ایمان پر گراں نہ گزری کہ ہم ان کو ووٹ دے رہے ہیں اور دلوا رہے ہیں پاؤ متانت سے گری ہوئی حرکات کے مجرم نہیں بلکہ شرابی' بدکار' سمگلر' تارک فرائض' مرتکب کبائر' فاسق' فاجر مسلمان ہیں۔ ان انتخابات میں فوٹو بھی تھے اور قد آدم تصاویر بھی' گانے بھی تھے اور رقص بھی اور یہ سب ہماری پی این اے اور آئی جی آئی کے نمائندے تھے لیکن ہمیں منکرات کو نظر انداز کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوا۔ ۸۸ء اور ۹۰ء میں ہمارے ارکان کے قد آدم پورٹریٹ ان کے حلقوں میں آویزاں تھے' ان پر کوئی صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی۔ ۱۹۹۰ء میں بھی ماں بیٹی کے بارے میں غلیظ الفاظ استعمال کئے گئے اور مجھے صرف ایک دبا دبا سا احتجاج موصول ہوا تھا۔ میں کہتا ہوں وہی سب کچھ ہوتا کہ جس کے خلاف کالم سیاہ کئے جا رہے ہیں لیکن قاضی حسین احمد نواز شریف کے ہاتھ ہاتھ میں دے کر کھڑے ہو جاتے تو ان سارے گناہوں پر پردہ پڑ جاتا۔ فرنٹ بھی قبول ہوتا' اس کا پرچم بھی' پاسبان بھی' اس کے نوجوان بھی۔ ظالم' بدکار' شرابی' حرام کھانے والے امیدوار بھی سر آنکھوں پر ہوتے بلکہ اب بھی اس کردار کے لوگوں کو ارکان تک نے ووٹ ڈالے۔ اس بات کا احساس ضروری ہے کہ معیار حب و بغض اللہ اور اس کے رسول ﷺ نہیں تھے' صرف پیپلز پارٹی کی نفرت اور نواز شریف کی محبت تھی۔"

خرم مراد صاحب نے تین سوالات بھی پوچھے ہیں اور وہ یہ ہیں:

"پہلا سوال یہ ہے ہم نے چن چن کر اور چھانٹ چھانٹ کر اور چھلنیاں لگا لگا کر اور برسوں دروازے پر کھڑا رکھ کر یہ کیسے امراء پر مشتمل کیسی مثالی تنظیم بنائی ہے کہ جہاں ہم تدبیر و حکمت عملی کے ایک سنگین اختلاف سے کامیابی سے نہیں گزر سکتے' جہاں معاملات میں محرمات کے ارتکاب پر پیشانی شکن آلود نہیں ہوتی مگر کیا موسیقی اور تصویر ایسے کبائر بن گئے ہیں جو ناقابل برداشت ہیں۔؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ ۵۴ سالہ جدوجہد کے بعد ہم نے جو اتنا سکڑا ہوا اور ناقابل اعتبار حلقہ متفقین بنایا ہے' اس کی وجہ کیا ہے۔؟ اس کا بڑا حصہ کراچی میں پھسل کر ایم کیو ایم کی طرف چلا گیا اور پنجاب میں نواز شریف کی طرف' اس کو اپنوں سے زیادہ غیروں پر اعتماد ہے اور میرا سوال یہ کہ اگر ہم عامتہ المسلمین کو اپنے اندر جذب کرنے کو تیار نہ ہوں اور نہ ہم ان کی رائے کے مطابق سیاسی پالیسی اختیار کرنے کو تیار ہوں تو پھر رائے عامہ کے بل پر تبدیلی لانے کی ایسی سیاست سے آخر کیا حاصل ہو گا۔؟"

خرم صاحب کے یہ تین سوالات جماعت اسلامی کے لئے نہیں سب دینی جماعتوں اور اسلامی تحریکوں کے لئے اہم ہیں' ان پر غور ہونا چاہئے۔ OO

بقیہ ایک تاثر

ہوئے۔ یہ بہت ہی مفید پروگرام تھا۔ کم از کم ایک موضوع پر تو رفقاء کو کافی مواد مل جاتا ہے جو ان کے لئے دعوت کے کاموں میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ ویسے تو ہماری پوری تحریک کی بنیاد قرآن حکیم پر ہے۔ ہمارا دعوتی لٹریچر بھی قرآن ہی ہے اور آلۂ انقلاب بھی قرآن۔ اسی کا ایک عکس ان تقاریر میں بھی نظر آیا کہ تمام رفقاء نے اپنی تقاریر قرآن حکیم کی آیات بینات کو بنیاد بنا کر کیں۔

ایک اہم بات جو میں نے بھی نوٹ کی اور بعد میں ایک اور رفیق نے بھی اس کی طرف توجہ مبذول کرائی وہ یہ ہے کہ اس سالانہ اجتماع پر ملک کے تقریباً ہر گوشے سے رفقاء نے شرکت کی۔ میں نے ایک چھوٹا سا سروے بھی کیا کہ شائد فلاں جگہ سے' فلاں ضلع سے کوئی رفیق نہ آیا ہو لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ تقریباً ہر ضلع اور تحصیل سے کوئی نہ کوئی رفیق ضرور موجود تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ الحمدللہ ہماری دعوت ملک بھر میں پھیل رہی ہے اور آہستہ آہستہ اس کا ابلاغ عام ہو رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جن تک یہ نور توحید اور پیغام انقلاب پہنچا ہے' وہ اس کی خیرات کس فیاضی سے کرتے ہیں اور کس حد تک اپنے جان و مال کو اس کے افشا میں کھپاتے ہیں۔

سالانہ اجتماع کا آخری پروگرام نئے رفقاء کا بیعت سمع و طاعت سے مشرف ہونا تھا۔ اگرچہ دوسرے رفقاء نے بھی تجدید عہد کے لئے بیعت کے الفاظ امیر محترم کی اقتداء میں دہرائے۔ جب امیر محترم رفقاء سے بیعت لے رہے تھے تو چشم تصور میں زمانہ رسالت پھر گیا۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ چشم فلک نے تو وہ منظر بھی دیکھا ہو گا جب اللہ کے آخری نبی ﷺ اپنے جانثاروں سے بالکل انہی الفاظ میں بیعت لیا کرتے تھے۔ آج چودہ سو سال بعد ایک بار پھر اللہ نے اپنے ایک عاجز بندے کو اس سنت نبوی کو زندہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی جب بڑے بڑے علماء تہذیب حاضر کی چکاچوند اور جمہوریت کے سحر کا شکار ہو گئے ہیں۔ میں نے اس موقع پر اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر دوڑائی تو ہر چہرے پر خشیت الٰہی کو طاری پایا۔ شائد اس بوجھ کا خوف ہو جو بیعت کے ذریعے اٹھایا جا رہا تھا۔ ان کے قلوب سے یہ آواز اٹھ رہی ہو گی کہ پروردگارا ہمارے نحیف و ناتواں کندھوں کو قوت بخش کہ ہم اس بوجھ کو اٹھا سکیں اور میر کاروان کے چشم ابرو کے اشارے پر نقد جان پیش کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین کے لئے منتخب فرمالے' آمین۔ OOO

جماعتوں اور اشخاص کے بارے میں انتہاپسندانہ رویہ پسندیدہ نہیں

میں اول و آخر پاکستانی ہوں

ڈاکٹر اسرار احمد

میرا فکری "امام" کانگریس کا صدر نہیں' الہلال اور البلاغ والا آزاد ہے

قومی روزنامے نوائے وقت کے ایک شذرے کے جواب میں جو اسی صفحہ پر علیحدہ باکس میں موجود ہے' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی یہ تحریر اسی کے ادارتی صفحات میں شائع ہوئی۔

میں "نوائے وقت" کے اداریہ نگار کا ممنون ہوں کہ اس نے اپنے یکم نومبر کے شذرے کے ذریعے میرے لئے بعض شخصیتوں اور تحریکوں کے بارے میں اپنے موقف کی وضاحت کا ایک اور موقع پیدا کر دیا۔ اگرچہ اس اعتبار سے حیرت اور تعجب کا اظہار کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ ع "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے' باغ تو سارا جانے ہے!" کے مصداق میری وہ آراء جواب' بحمد اللہ' بہت بڑے حلقے میں معروف و مشہور ہو چکی ہیں' اس روزنامے کے حلقہ ادارت سے وابستہ شخص کے علم میں نہیں ہیں' جس میں میرا وہ ہفتہ وار کالم ڈیڑھ سال سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے' جو اکثر ہفتہ میں ایک ہی نہیں دو دو اور تین تین بار بھی چھپتا ہے۔ بہرحال میں ۔ "یارب وہ نہ سمجھے ہیں' نہ سمجھیں گے میری بات ۔ دل اور دے ان کو' جو نہ دے مجھ کو زباں اور!" کی دعا کے ساتھ ساتھ اپنے موقف کی وضاحت کی ایک اور کوشش کر رہا ہوں۔

جہاں تک مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا تعلق ہے' اگرچہ میں ان کے علم و فضل' تقویٰ و تدین' محنت کشی اور سخت کوشی' اور سب سے بڑھ کر انگریزی استعمار کے خلاف بے باکانہ اور مجاہدانہ کردار کا تہہ دل سے معترف ہوں اور اس اعتبار سے میرے دل میں ان کی بے حد عزت اور احترام بھی ہے اور ایک گونہ محبت و عقیدت بھی' تاہم میں نے آج تک نہ کبھی انہیں اپنا "امام" قرار دیا' نہ اپنے آپ کو کبھی ان کے "مقتدی" کی حیثیت سے پیش کیا۔ اور جہاں تک ان کے سیاسی موقف اور مسلک کا تعلق ہے' میں نے نہ صرف یہ کہ اس سے اپنے اختلاف کا اظہار ہمیشہ نہایت و اشگاف الفاظ میں کیا ہے۔ بلکہ بین السطور اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ اگرچہ مولانا مدنیؒ کم از کم برعظیم پاک و ہند کی حد تک چودھویں صدی ہجری کی عظیم ترین مذہبی شخصیت یعنی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے شاگرد خاص بھی تھے

ڈاکٹر صاحب کے تازہ ارشادات!

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے ایک خطبہ میں کہا ہے کہ پچاس سال پہلے آزادی کی تحریک اور مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان سے مولانا مودودی مرحوم اس لئے لاتعلق رہے تھے کہ ان کے نزدیک ایک اسلامی حکومت صرف وہی لوگ قائم کر سکتے ہیں جو خود اپنی زندگیوں پر اسلام نافذ کر چکے ہوں ورنہ تو ایک قومی حکومت وجود میں آ سکتی ہے جس کا تعلق دین سے اتنا ہی ہو گا جتنا بالفعل عوام کی بھیڑ کا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد اپنے خطبات میں فخریہ انداز میں یہ بات کہتے رہتے ہیں کہ زمانہ طالب علمی میں ان کا تعلق ایم ایس ایف سے رہا۔ اس طرح وہ تحریک پاکستان سے اپنا ناطہ جوڑتے ہیں تاہم مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام مرحومین کو بھی اپنا راہنما تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح مولانا مودودی کے قیام پاکستان کے وقت موقف کو برحق تسلیم کرتے ہیں جبکہ بعد کے موقف کو جب انہوں نے نوزائیدہ اسلامی مملکت کے قومی دھارے میں شامل ہو کر سیاست کا آغاز کیا' غلط قرار دیتے ہیں۔ ایسے مواقع پر جب قوم کو واقعی ان جیسے دانشور کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کے پیروکار یہ توقع رکھتے ہیں کہ قومی زندگی کے اس اہم موڑ پر انہیں جو کردار ادا کرنا ہے ڈاکٹر صاحب اس کے بارے میں واضح راہنمائی فرمائیں گے' ڈاکٹر صاحب بالعموم بیرون ملک فرار ہو جاتے جو ان کی جراءت و بے باکی کے منافی ہے۔ لیکن واپس آ کر ڈاکٹر صاحب اس عمل میں مین میخ نکال رہے ہیں جس میں شرکت کی وہ جرات نہیں کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب کے تازہ ارشادات سے ایک تو یہ بات ایک بار پھر سامنے آئی ہے کہ مولانا مودودی مرحوم تحریک پاکستان سے لاتعلق رہے اور اسلامیان برصغیر کے قومی موقف کی حمایت کرنے سے محروم رہے۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر صاحب اسے درست سمجھتے ہیں تاہم ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھا جا سکتا ہے اگر برصغیر کے مسلمان قائداعظم اور ان کے ساتھیوں کی رائے سے اتفاق نہ کرتے اور مولانا مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی پیروی میں اکھنڈ بھارت کی راہ ہموار کرتے تو آیا ان کے نظام خلافت کے لئے ماحول سازگار ہوتا اور اب تک وہ اور دیگر دینی جماعتیں اسلامی نظام کے نفاذ کی منزل حاصل کر چکے ہوتے۔ فیاللعجب!!.. ڈاکٹر صاحب کو اب علمی انا کے مینارہ سے اتر کر حقیقت پسندی سے کام لینا چاہئے۔ زمینی حقائق کا ادراک کرنا چاہئے ورنہ وہ بھی کل کو قاضی و قادری کی صف میں کھڑے دکھائی دیں گے۔

"نوائے وقت" یکم نومبر ۱۹۹۳ء

اور ان کے زمانہ اسیری مالٹا کے دوران ان کے رفیق ہی نہیں خادم خاص بھی' مزید برآں دارالعلوم دیوبند کی مسند درس پر ان کے جانشین بھی وہی قرار پائے ------ لیکن سیاسی و ملی مساعی کے میدان میں حضرت شیخ الہندؒ کے اصل "خلیفہ" کی حیثیت انہیں نہیں' مولانا ابوالکلام آزاد کو حاصل ہے------ اس لئے کہ نومبر ۱۹۲۰ء میں دہلی میں "جمعیت العلماء ہند" کا جو دوسرا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا اس میں حضرت شیخ الہندؒ کی جانب کے جو صدر جلسہ تھے "امامت ہند" کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کا نام تجویز ہوا تھا مولانا مدنیؒ کا نہیں!

البتہ جہاں تک مولانا ابو الکلام آزاد کا تعلق ہے نہ صرف یہ کہ میں انہیں اپنا "امام" تسلیم کرتا رہا ہوں اور ڈنکے کی چوٹ کرتا رہوں گا بلکہ ان ہی کے واسطے سے اپنا دینی سلسلہ نسب حضرت شیخ الہندؒ سے جوڑتا ہوں۔ لیکن اس صراحت کے ساتھ کہ میرا "امام" صرف ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کا ابو کلام ہے' دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ روایتی علماء کی مخالفت سے بددل ہو کر ۱۹۲۰ء میں "حزب اللہ" کی بساط بالکل لپیٹ دی تھی' جبکہ بحمداللہ ہم نے ٹھیٹھ قرآنی اصطلاحات یعنی اقامت دین' اور غلبہ دین حق وغیرہ اختیار کیا۔ اور اس کے لئے اللہ کے فضل و کرم سے "بیعت سمع و طاعت فی المعروف" ہی کے اصول پر "تنظیم اسلامی" قائم کی' جو ایک دھیمی لیکن پیہم رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ (چنانچہ ابھی اس کا انہارواں سالانہ اجتماع نہایت وقار اور متانت کے ساتھ منعقد ہوا ہے!)۔ علیٰ ہذا القیاس مولانا آزاد کی تحریک خلافت کی اصل حیثیت خلافت عثمانیہ کے خلافت ہونے والی ریشہ دوانیوں کے خلاف پر زور صدائے احتجاج کی تھی جبکہ ہماری تحریک خلافت نظام خلافت علیٰ منہاج النبوت کو دنیا میں از سرنو قائم کرنے کے لئے ہے۔

بہرحال ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک والے مولانا آزاد یقیناً میرے "امام" ہیں اور اس قاعدہ کلیہ کے مطابق پر اکہرے ثواب کا مستحق بہرحال ہوتا ہے۔

اب آیئے مولانا مودودی اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی کے بارے میں میرے موقف کی جانب۔ میں مولانا مودودی کو فی الاصل مولانا آزاد کا جانشین' اور ان کی دعوت اور تحریک کو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک والے ابو کلام ہی کی دعوت اور تحریک کا تسلسل سمجھتا ہوں' اور اس اعتبار سے انہیں بھی اپنا "امام" تسلیم کرتا ہوں اور اسے سوء اتفاق ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ میں مولانا مودودی کی دعوت اور تحریک کے بھی صرف آٹھ ہی سالوں کو بحیثیت مجموعی درست سمت میں اور ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر مبنی سمجھتا ہوں یعنی ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک۔ اس لئے کہ اگرچہ جماعت اسلامی کا قیام بالفعل تو ۱۹۴۱ء میں عمل میں آیا تھا' تاہم اس کی اساس جن اصولوں پر رکھی گئی تھی وہ ۴۰ - ۱۹۳۹ء کے دوران ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں شائع ہونے والے سلسلہ مضامین میں بیان ہوئے تھے جن کا اختتام: "ایک صالح جماعت کی

جس کام کا آغاز مولانا آزاد نے کیا تھا ربع صدی سے اپنی توانائیاں اسی کام میں کھپا رہا ہوں۔

اس کے بعد کا نہیں۔ اس لئے کہ اپنی زندگی کے اس آٹھ سالہ دور میں مولانا آزاد مرحوم نے کم از کم بیسویں صدی عیسوی کی حد تک پہلی بار ان کاموں کا آغاز کیا تھا جن میں اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم' اور تائید و توفیق سے گذشتہ ربع صدی سے زیادہ عرصہ سے اپنی بہتر اور بیشتر توانائیاں کھپا رہا ہوں یعنی دعوت رجوع الی القرآن' اور اس کے لئے نوجوانوں کی ایک ٹیم کی تیاری کے لئے "دارالارشاد" کا قیام' حکومت الہیہ کے قیام کی پر زور دعوت اور اس کے لئے بیعت کی مسنون اساس پر "حزب اللہ" کا قیام' اور بالآخر "تحریک خلافت"۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انہوں نے دعوت رجوع الی القرآن کا غلغلہ زیادہ تر تحریری طور پر بلند کیا تھا اور پھر اس کے لئے جو ادارہ قائم کیا تھا وہ ان کی سیاسی مصروفیات کی باعث پوری طرح چلنے بھی نہ پایا تھا کہ ختم ہو گیا' جبکہ میں نے بفضلہ تعالیٰ "عوامی درس قرآن" کا میدان اختیار کیا' اور جو ادارے قائم کئے یعنی انجمن خدام القرآن' قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج وہ بھی بحمداللہ نہ صرف قائم ہیں' بلکہ خواہ سست روی کے ساتھ ہی سہی' بہرحال مسلسل ترقی کر رہے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اقامت دین کی جدوجہد کے لئے "حکومت الہیہ" کی عام فہم اصطلاح استعمال کی تھی اور پھر کچھ کہ "الفضل للمتقدم" یعنی اصل درجہ فضیلت پہل کرنے والے ہی کو حاصل ہوتا ہے' میں ان کی عظمت اور فضیلت کا تہہ دل سے قائل ہوں۔ تاہم ۱۹۲۰ء کے بعد سے جب انہوں نے اپنا اصل میدان تحریک آزادی ہند کو بنالیا۔ اور اس کے لئے کانگریس میں شمولیت اختیار کرلی تو اس کے بعد والے ابو کلام سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔ اور میں جو اختلاف مولانا مدنیؒ کے طرز عمل سے رکھتا ہوں وہی اختلاف مجھے مولانا آزاد کے طرز عمل سے بھی ہے۔ بلکہ مولانا مدنیؒ کے مقابلے میں شدید تر' اس لئے کہ مولانا مدنیؒ نے تو اپنے جداگانہ پلیٹ فارم یعنی "جمیعت العماء ہند" کے پلیٹ فارم سے انڈین نیشنل کانگرس کی صرف ہمنوائی کی' جبکہ مولانا آزاد تو اس میں باضابطہ شامل ہو کر اس کا جزو لاینفک بن گئے تھے۔

البتہ یہ واضح رہے کہ حضرت مدنیؒ ہوں یا مولانا آزاد' ان کی سیاسی رائے اور موقف سے شدید اختلاف رکھنے کے باوجود میں ان کی نیت پر حملہ کو خود حملہ کرنے والے کی نیت کے فساد کا مظہر سمجھتا ہوں۔ ان حضرات کی رائے خلوص اور دیانت پر مبنی تھی اور میرے نزدیک ان کی حیثیت فقہ کی اصطلاح میں ایسے اجتہاد کرنے والے شخص کی سی ہے جس کی رائے کسی سبب سے غلط ہو جاتی ہے' لیکن وہ اپنی حسن نیت کی بنا ضرورت" نامی تحریر سے ہوا تھا۔

بہرحال میرے نزدیک جماعت اسلامی کی تاریخ کے یہ آٹھ سال ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کا نقشہ پیش کرتے ہیں' جو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی ایک قومی تحریک کے خدوخال سے کسی طور بھی مشابہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ تحریک مسلم لیگ یا تحریک پاکستان کے بارے میں ان کے اس موقف کو میں صد فی صد درست سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی ایک قومی تحریک کے نتیجے میں صرف ایک قومی ریاست ہی قائم ہو سکتی ہے' اسلامی ریاست وجود میں نہیں آ سکتی۔ اسلامی ریاست کے قیام کے لئے (یا بالفاظ دیگر اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے) تو بہرحال ایک ایسی جماعت درکار ہے جس میں شامل ہونے والے لوگ پہلے اپنے وجود اور اپنی ذات' اور پھر اپنے دائرہ اختیار یعنی اپنی معاشرت اور معیشت میں شریعت اسلامی پر بالفعل کاربند ہوں۔ اور پھر ایک منظم جماعت کے ڈسپلن کو قبول کرکے ایک "بنیان مرصوص" کی صورت اختیار کرلیں۔ تاہم اس معاملے میں مولانا مودودی کی اس روش کو غلط اور انتہاپسندی پر مبنی سمجھتا ہوں کہ انہوں نے تحریک پاکستان اور تحریک مسلم لیگ اور اس کی قیادت پر شدید اور بعض اوقات دلآزار تنقیدیں کیں۔ اور اپنی بعض تحریروں میں تو مسلم قوم پرستی

کے ڈانڈے کفر تک ملادیئے۔ جبکہ میرے نزدیک مسلمانوں کی دنیوی فلاح اور بہبود' اور ان کے حقوق کے حصول یا ان کی پاسداری کی جدوجہد بھی ہرگز نہ حرام ہے نہ مکروہ بلکہ پسندیدہ اور مطلوب ہے' جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صرف آل فرعون کو اسلام اور ایمان کی دعوت دینے کے لئے نہیں' بلکہ بنی اسرائیل کو ان کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے بھی مبعوث فرمایا تھا۔ تاہم مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی سعی وجدوجہد کے مقابلے میں اسلام کی سربلندی کے لئے' اس کی جملہ شرائط پوری کرتے ہوئے' جدوجہد کرنا یقیناً بہت افضل اور اعلیٰ ہے۔ گویا میرے نزدیک اس وقت مولانا مودودی کا موقف یہ ہونا چاہئے تھا (کاش کہ ایسا ہوجاتا!) کہ چونکہ فی الوقت ہم اپنی جملہ توانائیاں اقامت دین کی جدوجہد کے بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں لہٰذا ہم مسلمانان ہند کی قومی جدوجہد کا بالفعل ساتھ نہیں دے سکتے۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اوائل عمری ہی سے اس انتہاپسندی سے بچائے رکھا ہے۔ چنانچہ "نوائے وقت" کے یکم نومبر کے شذرے کے ضمن میں میں مولانا سید حسین احمد مدنی' مولانا ابوالکلام آزاد' اور تقسیم ہند سے قبل تک کے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے بارے میں اپنے موقف کی وضاحت میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ' بحمداللہ' ان اعاظم رجال کے بارے میں بھی میں کبھی اس افراط و تفریط میں مبتلا نہیں رہا کہ اگر مولانا مدنیؒ اور مولانا آزاد کے سیاسی موقف سے اختلاف تھا تو انہیں کانگریس کا زر خرید اور ہندو کا ایجنٹ بھی لازماً قرار دوں' اور اگر مولانا آزاد اور مولانا مودودی کو میں نے ایک بار اپنا "امام" تسلیم کر لیا تو اپنے ذہن اور ضمیر کو ہمیشہ کے لئے ان کے پاس گروی رکھ دوں۔ اور ان کی کسی رائے یا طرز عمل سے اختلاف کو گناہ سمجھنے لگوں۔ اب اس کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان' تحریک پاکستان' اور زعمائے تحریک پاکستان کے بارے

مولانا مدنی کے مجاہدانہ کردار کا معترف ہوں لیکن ان کے سیاسی موقف سے اختلاف ہے۔

ہم مسلمانوں میں اپنے دور زوال میں جو چند در چند کمزوریاں پیدا ہوگئی ہیں ان میں سے ایک اشخاص و افراد' اور تحریکوں اور جماعتوں کے بارے میں انتہا پسندانہ رویہ بھی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم جس شخص یا جماعت کے گرویدہ ہوجاتے ہیں ان میں ہمیں سب خیر ہی خیر اور حسن ہی حسن نظر آنے لگتا ہے' ان کا کوئی نقص یا عیب نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس جس سے ہمیں اختلاف ہوجائے وہ ہمیں مجسم شر نظر آنے لگتا ہے اور اس کی کسی خوبی یا بھلائی کا اعتراف ہمیں گویا گناہ نظر آنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ مرض ہمارے اندر پوری شدت کے ساتھ پیدا ہوگیا ہے جس کی جانب نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا تھا کہ : "تمہارا کسی چیز سے محبت کرنا تمہیں اندھا اور بہرا بنادیتا ہے!" (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم)۔ اس ضمن میں زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ بیماری ہمارے مذہبی طبقات میں کچھ زیادہ ہی شدید بلکہ مہلک حد تک پائی جاتی ہے۔ وہ بالعموم جس کے گرویدہ اور عقیدت مند ہوں انہیں کم از کم "معصوم" ورنہ فرط محبت و عقیدت میں "معبود" کے درجہ تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔ اور جس سے اختلاف ہوجائے اسے ضال اور مضل ہی نہیں کافر اور زندیق قرار دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پس منظر میں میں اپنی آراء' اور اپنا طرز عمل بھی اختصار سے بیان کردوں۔

میں نے بارہا بیان کیا ہے کہ میرے ذہن اور مزاج کی ساخت میں اولین اور موثر ترین دخل علامہ اقبال کی ملی شاعری کو حاصل ہے۔ دس گیارہ برس کی عمر سے میں نے "بانگ درا" کو کچھ سمجھے اور کچھ بے سمجھے ترنم کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تھا۔ اور چودہ پندرہ برس کی عمر تک مجھے حضرت علامہ کا تقریباً پورا اردو کلام ازبر ہوچکا تھا۔ اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ تھا کہ ہائی سکول کے طالبعلم کی حیثیت سے میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا فعال کارکن تھا۔ اور اس اعتبار سے مجھے گویا تحریک پاکستان کے اولیٰ کارکنوں میں شمولیت کا شرف حاصل ہے۔ (واضح رہے کہ میں حصار ڈسٹرکٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری تھا اور ۴۶ء میں فیڈریشن کا جو اہم اجلاس حبیبہ ہال' اسلامیہ کالج' ریلوے روڈ' لاہور میں منعقد ہوا تھا' جس میں قائداعظم نے بھی شرکت فرمائی تھی' اس میں میں بھی ضلع حصار کے دو مندوبین میں سے ایک کی حیثیت سے شریک تھا۔) چنانچہ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ" کے زور دار نعرے بھی لگائے تھے' اور "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!" کے ترانے بھی زور شور سے الاپے تھے۔ مزید برآں "نوائے وقت" کے بنڈلوں کے انتظار میں ریلوے سٹیشن پر حاضری بھی دیتا رہا تھا' اور پاکستان کے جھنڈے ہم نے نہ صرف مکانوں پر لہرائے تھے' بلکہ ان کے چھوٹے چھوٹے بیج خود اپنے سینوں پر بھی سجائے تھے' اور ہزاروں کی تعداد میں تقسیم بھی کئے تھے!

اس زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس سے جو ذہنی اور قلبی بعد تھا' اس کے باعث "کانگرسی علماء" سے ظاہر ہے کہ کسی ذہنی یا قلبی قرب کا امکان ہی نہیں تھا۔ چنانچہ مولانا مدنیؒ تو چونکہ صرف مدرس اور مقرر تھے' مصنف یا مولف تھے ہی نہیں' لہٰذا ان سے تو کسی ذاتی "تعارف" کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بس ان کے سیاسی موقف کے باعث ان سے ایک "غائبانہ حجاب" طاری رہا۔ (اگرچہ الحمدللہ کہ اس دور میں بھی میری زبان سے ان کی شان میں کوئی گستاخانہ یا توہین آمیز کلمہ نہیں نکلا۔) ان کے برعکس مولانا آزاد قلم کے شہسوار تھے لیکن ان کے ضمن میں بھی باوجود اس کے کہ میں نے بہت کوشش سے "مقالات الہلال" اور "مضامین الہلال" نامی کتابیں حاصل کیں۔ اور انہیں جیسے تیسے پڑھ بھی ڈالا تھا لیکن کچھ ان کی زبان کی ثقالت کے باعث' اور کچھ اپنے مذکورہ بالا ذہنی بعد کی بناء پر اس وقت مولانا آزاد سے بھی کوئی مناسبت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ تاہم مولانا مودودی' ان کی جماعت' اور ان کے موقف سے نہ صرف بہت حد تک واقفیت حاصل ہوچکی تھی' بلکہ ان کے ساتھ کسی قدر ذہنی اور قلبی ربط بھی قائم ہوچکا تھا۔ لیکن بحمداللہ اس نیم شعوری' بلکہ بے شعوری کے دور میں بھی یہ توازن برقرار تھا کہ ایک جانب میں جماعت اسلامی کے ہفتہ وار اجتماع میں بھی شریک ہوتا رہتا تھا اور مرزا مسرت بیگ مرحوم کے پرجوش اور ولولہ انگیز درس قرآن سے محظوظ ہوتا تھا تو دوسری جانب میری ساری عملی تگ و دو اور بھاگ دوڑ تحریک پاکستان ہی کے ضمن میں تھی۔ چنانچہ اسلامی جماعت کے لوگوں سے میں مسلم لیگ اور پاکستان کے دفاع میں جھگڑتا تھا تو مسلم لیگ اور فیڈریشن کے حلقوں میں مولانا مودودی کی مدافعت کرتا تھا۔ چنانچہ میرے ایک کلاس فیلو ولی اللہ خاں جو مسلم لیگ اور پاکستان کے پرجوش حامی اور فیڈریشن کے فعال کارکن تھے (اب وہ ملتان میں مقیم ہیں اور وکالت کرتے ہیں۔) مولانا مودودی کا نام بگاڑ

پاکستان کو جدید اسلامی ریاست بنانے کے لئے علامہ اقبال کی تعبیرجدید کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

کر "مردودی" کہا کرتے تھے جس پر میری ان سے کئی بار لڑائی ہوئی۔ اور ---- یادش بخیر' جس قسم کا شذرہ آج "نوائے وقت" نے میرے بارے میں شائع کیا ہے' اسی قسم کا شذرہ اس زمانے میں حمید نظامی مرحوم نے "مولانا مودودی کی خدمت بابرکت میں!" کے عنوان سے تحریر کیا تھا۔

الغرض' علامہ اقبال کے ان الفاظ کے مصداق کہ ع "میں اصل کا خاص سومناتی ا" میں بھی اصلاً اور ابتداءً مسلم لیگی اور پاکستانی ہوں ہی' مزید برآں جیسے جیسے میرا شعوری فکر پروان چڑھا یہ حقیقت مجھ پر زیادہ سے زیادہ منکشف ہوتی چلی گئی کہ پاکستان کا قیام مشیت ایزدی اور حکمت خداوندی میں اسلام کے عالمی غلبے اور کل روئے ارضی پر نظام خلافت علیٰ منہاج النبوت کے قیام کے طویل منصوبے کی اہم کڑی ہے۔ اور اس کی پشت پر اسلامیان ہند کی ۱۸۵۷ء کے بعد کی نوے سالہ قومی جدوجہد تو ہے ہی' دراصل اس کے ڈانڈے الف ثانی کی پوری تجدیدی مساعی کے ساتھ ملتے ہیں۔ البتہ جن دو اعاظم رجال کو اللہ تعالیٰ نے قیام پاکستان کا فوری ذریعہ اور سبب بنایا یعنی حکیم الملت علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح' ان کے مابین میں اس فرق و امتیاز کو لازمی سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے اصل مجوز و مفکر و مصور علامہ اقبال تھے۔ اور ان کا اصل جذبہ محرکہ احیاء اسلام تھا' جبکہ اس کے موسس اور بانی و معمار قائد اعظم تھے اور ان کا اصل جذبہ محرکہ مسلمانان ہند کی اکثریت کو ہندوؤں کی انتقامی اور استحصالی دست برد سے محفوظ کرنا تھا۔ اور اگرچہ ذاتی طور پر میں ان دونوں ہی کا ممنون احسان ہوں' لیکن چونکہ قائداعظم کا کام تو قیام پاکستان پر پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا جبکہ اسے ایک حقیقی اسلامی ریاست بنانے کا کام ابھی باقی ہے اور اس کے لئے اصل ضرورت علامہ اقبال کے فکر اور فلسفے اور سیاست' معیشت اور معاشرت کے میدان میں نظام اسلام کی اس تعبیر جدید کی ہے جو ان کے افکار و نظریات میں موجود ہے' لہٰذا جہاں دعوت و تحریک کے میدان میں میرے امام مولانا آزاد اور مولانا مودودی ہیں' وہاں فکر و نظر کے میدان میں میرے اصل "امام" علامہ اقبال ہیں۔

تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ جب قیام پاکستان کے فوراً بعد عید الفطر کے روز ہی حصار میں مسلمانوں پر ہندوؤں کے حملے شروع ہو گئے تو پورے ڈھائی ماہ اس کیفیت میں مبتلا رہ کر کہ ہر لحظہ موت زندگی کے مقابلے میں قریب تر محسوس ہوتی تھی' اور بالآخر حصار سے سلیمانکی ہیڈ ورکس تک ۱۷۰ میل کا فاصلہ ایک پیدل قافلہ کے ساتھ بیس دنوں میں استعاراتی نہیں بالکل واقعاتی طور پر "آگ اور خون کے دریا" عبور کر کے اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان پہنچنا نصیب ہوا۔ اور پھر سلیمانکی سے ایک ٹرک کے پچھلے حصے میں کھڑے ہو کر لگ بھگ پچاس میل کا سفر کچے راستے سے طے کر کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے اوکاڑہ پہنچے تو یہ دیکھ کر دل و دماغ کو شدید دھچکا لگا کہ وہاں بازار میں فحش فلمی گانوں کے ریکارڈ لاؤڈ سپیکر پر بلند آواز سے بج رہے تھے! چنانچہ مولانا مودودی کے موقف کی صداقت و حقانیت جو منطقی اور علمی طور پر پہلے بھی واضح تھی اب ایک واقعہ بن کر سامنے آکھڑی ہوئی ---- اور یہ حقیقت پورے طور پر منکشف ہو گئی کہ پاکستان کا حصول اور قیام تو صرف پہلا مرحلہ تھا۔ ع "وقت فرصت ہے کہاں' کام ابھی باقی ہے!" کے مصداق دوسرا اور اہم تر مرحلہ ابھی سر کرنا ہے' یعنی اسے ایک حقیقی اسلامی ریاست بنانے کا کٹھن کام ابھی باقی ہے۔ گویا بقول فیض۔ "نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی۔ چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی" چنانچہ ورود پاکستان کے فوراً بعد سے پاکستان کو ایک حقیقی اسلامی ریاست بنانے کے عظیم مقصد کی خاطر جو مولانا مودودی کا دامن تھاما تو پورے دس برس تک تھامے رکھا۔ پہلے پانچ سال پوری یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ' اور باقی پانچ سال ابتداءً کچھ بے چینی اور بے اطمینانی اور بالآخر واضح اور معین اختلاف کے ساتھ۔ اس لئے کہ یہ احساس تو مجھے ۵۳ء ہی میں ہو گیا تھا کہ جماعت اسلامی کی تحریک کی گاڑی کہیں غلط کانٹا بدل آئی ہے اور ہم کوئی غلط موڑ مڑ گئے ہیں' اگرچہ تعین کے ساتھ یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کانٹا کب بدلا گیا اور غلط موڑ کس مقام پر مڑا گیا' لیکن ۵۵ء میں یہ بات مجھ پر پورے طور پر منکشف ہو گئی کہ جماعت اسلامی نے قیام پاکستان کے بعد اپنے ان تین کاموں پر مستزاد وہ ابتداء سے کرتی چلی آ رہی تھی جو دو اضافی اقدام کئے ان میں سے ایک تو صد فی صد صحیح تھا' جبکہ دوسرا اتنا ہی غلط تھا' جس کے نتیجے میں جماعت اسلامی کی تحریک کی اساسی نوعیت ہی بدل گئی ہے۔ چنانچہ جو تین کام جماعت اپنے یوم قیام سے لے کر پورے چھ سال تک قومی جدوجہد کے دھارے سے کٹ کر پوری دلجمعی اور استقلال کے ساتھ کرتی رہی تھی وہ تھے : اولاً ذہنی اور فکری انقلاب' ثانیاً عملی اور اخلاقی اصلاح' اور ثالثاً ایک مضبوط نظم والی جماعت کا قیام اور اس کی توسیع ---- ان پر جس صحیح کام کا اضافہ ۴۸ء میں کیا گیا وہ تھا دستور اسلامی کا "مطالبہ" اور اس کے لئے عوامی مہم' جس کے نتیجے میں "قرار داد مقاصد" پاس ہوئی جو عہد حاضر میں احیائے اسلام کی جدوجہد کی راہ کا اہم سنگ میل ہے--- جبکہ دوسرا صد فی صد غلط قدم تھا انتخابی سیاست کے میدان میں داخلہ' جس نے جماعت اسلامی کو "ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت" کی بجائے "ایک اسلام پسند قومی سیاسی جماعت" بنا کر رکھ دیا---- چنانچہ اپنے اس تجزیئے کو میں نے ۱۹۵۶ء ہی میں جبکہ میری عمر کل چوبیس برس تھی ایک رکن جماعت اور پارٹی ورکر کی حیثیت میں ڈھائی سو صفحات پر پھیلی ہوئی تحریر میں مدلل اور مبرہن طور پر تحریر کر دیا تھا---- اور' بحمد اللہ' آج ۳۷ برس گزر جانے کے بعد بھی' جبکہ میں "مسنون عمر" تو پوری کر چکا ہوں طبعی عمر کے بھی آخری حصے میں ہوں' اپنے اس تجزیئے کو صد فی صد صحیح اور درست سمجھتا ہوں۔ چنانچہ ۵۶ء سے میرا مستقل موقف یہ رہا ہے' اور آج بھی ہے' کہ اگرچہ پاکستان کی سالمیت اور بقاء کے لئے یہاں جمہوری' سیاسی اور انتخابی عمل کا جاری رہنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی انسان کے زندہ رہنے کے لئے ہوا پانی اور غذا کی فراہمی۔ لیکن پاکستان کے استحکام اور اس کا باعزت اور باوقار وجود صرف اسلام کے سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام یعنی دین حق کے نظام عدل اجتماعی کے قیام میں مضمر ہے--- اور اس کے قیام کی جانب کوئی پیشقدمی انتخابی عمل میں شریک ہو کر ممکن نہیں' بلکہ صرف اور صرف انقلابی عمل کے ذریعے ممکن ہے۔ تاہم انتخابات میں حصہ لینے کو میں نے نہ کبھی حرام قرار دیا ہے نہ مکروہ تحریمی' بلکہ جو مذہبی جماعتیں اس میدان میں سرگرمی پر مصر ہی ہوں ان کو ہمیشہ یہ مشورہ دیا ہے کہ "یا چناں کن یا چنیں!" کے مصداق یا تو سب مل کر ایک جھنڈے تلے اور ایک پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لیں' یا پھر پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ ورنہ ۷۰ء کی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی

رہے گی۔ (اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ یہ اندازہ مجھے بھی نہیں تھا کہ اس بار تاریخ کا فیصلہ اس قدر بے رحمانہ" ہو گا جتنا بالفعل ہوا۔)

اس ضمن میں یہ وضاحت بھی مناسب ہے کہ میرے نزدیک جماعت اسلامی ہو یا کوئی دوسری مذہبی جماعت' ان کے انتخابات میں حصہ لینے کے فیصلے یا اقدام کو میں ہرگز کسی بدنیتی پر محمول نہیں کرتا۔ بلکہ اب سے ۳۷ سال قبل بھی میں نے اپنے متذکرہ بالا بیان میں اسے صرف "عجلت پسندی" پر مبنی قرار دیا تھا' اور آج بھی اسے بس سادہ لوحی کی بنا پر پاکستانی قوم اور معاشرے کی ذہنی و فکری' قلبی و روحانی' اور اخلاقی و عملی کیفیات کی غلط تشخیص کا مظہر اور شاخسانہ قرار دیتا ہوں۔ اور میرے نزدیک وہ غلط تشخیص اور تجزیہ یہ ہے کہ---"قوم کی عظیم اکثریت مسلمان تو ہے ہی' اس کے دلوں میں ایمان اور اللہ اور رسول ﷺ سے شدید محبت بھی موجود ہے' ساری خرابی صرف عمل میں کمی کی ہے' اور اس کی اجتماعی بے راہ روی کا اصل سبب ایک محدود برسراقتدار طبقہ ہے جو اس کے سر پر سوار ہے اور اسے جبراً الحاد اور سیکولرزم' اور مادیت و اباحیت کی جانب لئے جا رہا ہے' لہٰذا اگر قوم کے مذہبی جذبات کو اپیل بلکہ مشتعل کر کے کسی طرح انتخابات کے ذریعے ایک بار مسند اقتدار اور ایوان حکومت میں براجمان ہو جایا جائے تو پھر چونکہ ع "اگر ہو تا گل اپنا' باغ اپنا' باغباں اپنا!" کے مصداق نظام تعلیم بھی ہمارے اختیار میں ہو گا' اور جملہ ذرائع ابلاغ بھی ہمارے تسلط میں ہوں گے اور پھر "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" پر ریاستی اور حکومتی جبر کے ذریعے بھی عمل کیا جا سکے گا' لہٰذا اصلاح معاشرہ کا عمل باسانی مکمل کرلیا جائے گا۔ اس کے برعکس میری تشخیص اور تجزیہ' جو حالیہ انتخابات کے نتیجے میں تو نوشتہ دیوار بن کر سامنے آچکا ہے' یہ ہے کہ --- "اگرچہ یہ درست ہے کہ بے پردگی' عریانی' فحاشی اور اباحیت ہمارے صرف ایک محدود طبقہ "مترفین" یعنی صاحب دولت وثروت' یا صاحب حیثیت و وجاہت لوگوں میں ہے (اگرچہ اسے ہمارے پریس اور ذرائع ابلاغ نے بہت غیر متناسب طور پر بڑھا چڑھا کر پراجیکٹ کر دیا ہے۔) اور اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ شعوری الحاد اور مادہ پرستی بھی ہمارے صرف جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ایک حصے تک ہی محدود ہے'--- لیکن دوسری جانب واقعہ یہ ہے کہ جہاں ہمارے عوام کی معتد بہ تعداد مشرکانہ اوہام میں مبتلا ہے' -- وہاں عوام اور خواص دونوں کی عظیم اکثریت ع "عارف و عامی تمام بندۂ لات و منات" کے مصداق دنیا پرستی اور مادہ پرستی کے عملی شرک میں مبتلا ہیں۔ اور جسے ہم "ایمان" سمجھتے ہیں وہ اصل میں صرف ایک "موروثی عقیدہ" ہے حقیقی ایمان نہیں!"

بنابریں "کرنے کے اصل کام" یہ ہیں کہ :-

(۱) قرآن حکیم کی آیات بینات کے مدلل اور پرجوش ابلاغ کے ذریعے عوام اور بالخصوص جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ایک جانب الحاد اور مادیت' اور دوسری جانب مشرکانہ اوہام کے اندھیروں سے نکال کر توحید' معاد' اور رسالت پر ایمان کے نور میں داخل کیا جائے تاکہ وہ دنیا پرستی کے عملی شرک سے نجات پائیں۔

(۲) جو لوگ شعوری ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہو جائیں انہیں ایک جانب اللہ اور رسول ﷺ کی غیر مشروط اطاعت' اور دوسری جانب ایک ایسی جماعت کے نظم کی پابندی کا خوگر بنائیں جس کا کوئی فیصلہ اور اقدام قرآن وسنت سے متصادم' حدود شریعت سے متجاوز' اور شرافت اور شائستگی کے منافی نہ ہو۔

(۳) قول اقبال : ع "بانشہ درویشی درساز و دمادم زن!" یعنی "فقر اور درویشی کی روش اختیار کر کے خوب محنت کئے جاؤ!" کے مصداق ان دو کاموں پر پوری قوت مرکوز کرنے کے ساتھ ساتھ زبان اور قلم کی بھرپور استعداد' اور جملہ ممکن الحصول ذرائع ابلاغ کو بروئے کار لاکر "نہی عن المنکر باللسان" کا دینی فریضہ ادا کرتے رہیں۔ اور اس پر جس تمسخر و استہزاء یا معاشرتی دباؤ کا سامنا ہو اسے "صبر جمیل" کے ساتھ برداشت کریں۔

(۴) تاآنکہ جب عددی قوت مناسب حد تک فراہم ہو جائے' اور عملی' اخلاقی اور تنظیمی تربیت بھی معیار مطلوب تک پہنچ جائے تو ع "چوں پختہ شوی خود رابر سلطنت جم زن!" یعنی "پھر جب پوری طرح تیار ہو جاؤ تو حکومت وقت سے ٹکرا جاؤ!!" کے مصداق "نہی عن المنکر بالید" یعنی منکرات کے قوت کے ساتھ استیصال کے لئے' جن میں سرفہرست سود اور جاگیرداری ہیں' پرامن اور منظم مزاحمتی تحریک کی خاطر سر بکف اور کفن بردوش ہو کر میدان میں اتریں اور پھر ع "یا تن رسد بہ جاناں' یا جاں ز تن برآید" یعنی "یا جسم محبوب کے قدموں میں پہنچ جائے یا جان جسم سے نکل جائے" کے مصداق یا دین حق کا بول بالا کر کے دم لیں یا جام شہادت نوش کر لیں!

چنانچہ سورۃ یوسف کی آیت ۱۰۸ یعنی "کہہ دو کہ یہ ہے میرا راستہ! میں اللہ کی طرف بلا رہا ہوں' نہ صرف خود' بلکہ میرے متبعین بھی' (لیکن اندھے بہرے نہیں بلکہ) پوری طرح علیٰ وجہ البصیرت!" کے مصداق میں اور میرے ساتھی اسی راستے پر گامزن ہیں۔

آخر میں نوائے وقت کے شذرہ نگار کی خدمت میں دو باتیں ضمنی طور پر عرض ہیں:

(۱) ایک یہ کہ کیا ان کے نزدیک "قومی دھارا" صرف انتخابات میں حصہ لے کر کشاکش اقتدار میں شریک ہونے سے عبارت ہے؟-------اور کیا لوگوں کو ذہنی اور فکری طور پر اسلام کی تعلیمات پر مطمئن کرنا' ان کے قلوب و اذہان میں ایمان کی جوت جگانے کی کوشش کرنا' اور ان کی عملی اور اخلاقی اصلاح کی سعی کرنا "قومی دھارے" سے خارج ہیں؟ خصوصاً اس ملک کے "قومی دھارے" سے جس کا قیام بھی اسلام کے نام پر ہوا تھا اور جس کا استحکام بھی' وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ' اسلام ہی کے ذریعے ممکن ہے!

اور (۲) رہا آپ کا یہ مخلصانہ اور مشفقانہ "اندیشہ" کہ کہیں میں بھی "قاضی اور قادری کی صف میں کھڑا" نہ دکھائی دوں ----- تو گزارش ہے کہ یہ اس لئے بھی محال اور ناممکن ہے کہ کہاں مجھ جیسا حقیر اور ناچیز انسان' اور کہاں ان حضرات کا بلند و بالا مقام! چنانچہ کہاں میری یہ حیثیت کہ میں نے کبھی یہ بھی نہیں کہا کہ جس انقلاب کے لئے میں نے اپنی پوری زندگی اور کل متاع حیات صرف کر دی ہے اس کی کوئی جھلک اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں گا۔ کہاں ان حضرات کے یہ "دعوے" کہ ایک صاحب نے ۹۰ء میں کہا تھا کہ اس الیکشن میں تو ہم لازماً تیسری بڑی طاقت بن کر ابھریں گے ہی' آئندہ انتخابات میں حکومت یقیناً ہماری بنے گی اور اس طرح "مصطفوی انقلاب" کی تکمیل ہو جائے گی۔ اس لئے کہ ہم دعوت' تنظیم اور تربیت کے جملہ مراحل طے

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

الحمدللہ میں اپنے اسلاف کے بارے میں کبھی بھی افراط تفریط میں مبتلا نہیں ہوا۔

اس بار دوسری صف کے جوہر خوب نمایاں ہوئے، نظم و ضبط بھی مثالی تھا

تنظیم اسلامی کا اٹھارواں سالانہ اجتماع

ان محفلوں کی یاد بہت دنوں ستائے گی جن سے اٹھنے والے بچشم نم اٹھے

نثار احمد ملک

آج سے تقریباً اٹھارہ برس قبل ایک مرد حق ہیں نے اپنے تصور دین اور تصور فرائض کے تقاضے کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک مختصر سے قافلے کی بنا ڈالی۔ اس مختصر سے قافلے کی تشکیل کی پشت پر کسی شوق قیادت کے جذبہ کی تسکین نہ تھی بلکہ اپنے فرائض کی ادائیگی کا جذبہ کار فرما تھا۔ اگر جذبہ وذوق امارت ہوتا تو جماعت اسلامی سے علیحدگی کے فوراً بعد بغیر کسی انتظار کے جماعت بن سکتی تھی۔ اس اللہ کے بندے نے پہلے اپنے بزرگوں سے ہی التماس کی کہ وہ کوئی ہیت اجتماعیہ تشکیل دیں، جب ان سے شدید مایوسی ہوئی تو پھر اس بھاری پتھر کو خود ہی اٹھالیا، لیکن چوم کر چھوڑا نہیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک زمانے نے کتنی کروٹیں بدلیں، کتنے ہی لوگ دنوں کے الٹ پھیر کے ساتھ بدلتے چلے گئے۔ ان کی ایسی قلب ماہیت ہوئی کہ اپنی معاشرت میں بھی تہذیب مغرب کو سینے سے لگالیا۔ ان کا تصور دین یکسر بدل کر رہ گیا۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے **حیران** ہو کر رہ گئے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو انقلاب اسلامی کے لئے لکھتے نہ تھکتے تھے۔ جن کا ایک ایک لمحہ اس صبح کے لئے وقف تھا جس کے طلوع ہونے کے ابھی کوئی آثار نہ تھے۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے قابل احترام بزرگ بھی ہیں جنہوں نے اقامت دین کے تصور سے ہی جان چھڑالی اور کونوں کھدروں میں بیٹھ کر کتابوں کے انباروں کی اوٹ لے لی۔

یہ اندھی عقیدت سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ اظہار حقیقت کے لئے لکھ رہا ہوں کہ ان تمام نظریاتی اور فکری آندھیوں میں بھی ایک شخص ایسا تھا جو اپنی قندیل لئے اس مقام پر کھڑا رہا جہاں وہ پہلے دن کھڑا تھا۔ کوئی لالچ، کوئی عہدہ اور کوئی دھمکی اس کے قدموں کو ڈگمگا نہ سکی۔ اس شخص نے اس وقت بھی قرآن کو اپنا امام بنایا تھا، آج بھی وہ اسی کتاب کو جو کبھی بوسیدہ نہ ہوگی، سینے سے لگائے ہوئے اور ہادی ورہنما بنائے ہوئے ہے۔ حجروں میں بیٹھ کر قرآن حکیم کا درس دینا یا اس کی تفسیر لکھنا آسان ہے کیونکہ اس کی مزاحمت نہیں ہوتی چنانچہ یہ کام پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ بلا روک ٹوک ہوتا رہے گا لیکن قرآن کو قریہ قریہ، شہر شہر اور گلی گلی ایک ایسے نور کے طور پر پہنچانا بہت مشکل کام ہے جو اوہام کی تاریکی اور باطل نظریات کی نظربندی کو ہوا میں تحلیل کر کے رکھ دے۔

تنظیم اسلامی کو قائم ہوئے اٹھارہ برس بیت گئے۔ اس دوران بہت سے رفقاء نے اس تحریک میں شمولیت اختیار کی اور بہت سے داغ مفارقت بھی دے گئے۔ بعض تو کسی اور ہم عصر اجتماعیت میں شامل ہو گئے اور اپنے انداز میں فرائض دینی کی ادائیگی کرنے لگے، بعض دام ہمرنگ زمیں کا شکار ہو کر اقامت دین کی فرضیت سے ہی جان چھڑا چکے اور گوشہ عافیت میں بیٹھ گئے ہیں جب کہ بعض تصوف کی وادیوں میں گم ہو

اٹھارویں سالانہ اجتماع میں قرآن آڈیٹوریم کا عمومی منظر جو متعدد نشستوں میں تنگ دامنی کا شاکی نظر آیا

کر "ذکر و فکر صبح گاہی" میں مست بھی ہو گئے' لیکن تنظیم اسلامی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ تحریکوں کی مثال گاڑی کی سی ہے جو اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتی ہے' ہاں کچھ نئے مسافر چڑھتے ہیں تو کچھ پرانے اتر بھی جاتے ہیں۔

ہم نے تو آغاز سے انجام سفر جانا ہے
تم نے دو چار قدم چل کے ٹھہر جانا ہے

تنظیم اسلامی کے امیر محترم نے رفاقتوں کی قربانی دے دی لیکن کسی کو خوش کرنے کے لئے اپنے افکار میں کتربیونت نہیں کی۔ اسی راہ عزیمت پر قائم و دائم ہیں جس کو علی وجہ البصیرت اختیار کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر محترم مدظلہ کی استقامت ہی ان کی اصل کرامت ہے' بقول اقبال۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

امیر محترم مدظلہ نے آج سے اٹھارہ برس پہلے جو جماعت تشکیل دی تو آج اس کا اٹھارواں سالانہ اجتماع تھا' چند مشاہدات و تاثرات ہیں جو اس اجتماع کے حوالے سے آپ کے سامنے رکھنے ہیں۔

تحریکوں کی زندگی میں سالانہ اجتماعات کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ اس کی اہمیت کا تین پہلوؤں سے جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ان اجتماعات کی ضرورت و اہمیت کے حوالے سے پہلی بات تو تربیتی نقطہ نظر سے ہے۔ کسی بھی جماعت کے کارکنوں کے لئے اپنی فکر کو مستحضر رکھنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اگر بنیادی فکر' منزل کا شعور اور نصب العین ذہن سے نکل جائیں گے تو پھر جماعت کے ساتھ چلنا مشکل ہو

تنظیم کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر عبدالخالق جن کی منصوبہ بندی نے اجتماع کے پروگراموں میں بہت مفید تنوع پیدا کیا۔

میر کارواں ڈاکٹر اسرار احمد ..... "متاع فقیر" اپنے قافلے میں لٹاتے ہوئے

جاتا ہے۔ اس تربیتی پہلو کو بھی ہم دو نکات میں واضح کر سکتے ہیں۔ پہلا نکتہ تو فکری تربیت سے متعلق ہے۔ یہ جماعت کیوں بنائی گئی؟ میں اس جماعت میں کیوں شامل ہوا؟ ہمارا نصب العین ہے کیا؟ ہمارا طریق کار کیا ہے؟ ہمارے اور دوسری جماعتوں میں فرق کیا ہے؟ ان تمام باتوں کو تازہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دوسرا نکتہ عملی تربیت سے متعلق ہے۔ اس علمی تربیت کے بھی دو پہلو ہیں' ایک پہلو تو روحانی ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے گہری محبت اور تعلق بذریعہ فرائض و نوافل۔ دوسرا پہلو بحیثیت داعی ہے کہ ایک داعی میں اضافی صفات کونسی ہوتی ہیں' دعوت کے اصول کیا ہیں' دعوت کا ہدف کیا ہونا چاہئے؟ پھر یہ کہ ایک داعی کو دعوت کے کن کن اسالیب کو سامنے رکھنا ہے؟ میں سمجھتا ہوں ہمارا اس بار کا سالانہ اجتماع ان تمام تربیتی پہلوؤں کے اعتبار سے کامیاب رہا ہے۔

ان سالانہ اجتماعات کی اہمیت آئندہ کی منصوبہ بندی کے حوالے سے بھی وہ چند ہو جاتی ہے۔ ان اجتماعات کے مواقع پر اپنی گزشتہ کارگزاری کا جائزہ لیا جاتا ہے اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے میں میر کاروان اور اہل حل و عقد کو آسانی ہوتی ہے۔ اس سالانہ اجتماع کے موقع پر جو گزشتہ سال کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی گئی وہ اعداد و شمار کے اعتبار سے تو نہیں لیکن اس حوالے سے بہت حوصلہ افزا تھی کہ حقائق پر مبنی تھی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ کسی بھی انقلابی جماعت کو اپنی طاقت کا صحیح صحیح اندازہ ہونا چاہئے اس لئے کہ اگلا قدم تب ہی اٹھایا جا سکتا ہے جب اپنی قوت کا اچھی طرح اندازہ ہو ورنہ تحریکیں کسی بہت بڑے حادثہ کا شکار ہو سکتی ہیں اور ماضی میں ہوتی بھی رہی ہیں۔

سالانہ اجتماعات کی اہمیت کا تیسرا پہلو رفقاء کا باہمی تعارف ہے۔ ظاہر ہے ہم سب لوگ اللہ کے کلمے کی سربلندی کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ ہمارے سامنے کوئی اور مقصد نہیں ہے۔ ایسے لوگ جو اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے جمع ہوئے ہوں ان کے لئے ایسے اجتماعات بہت اہم ہوتے ہیں۔ انہیں جو اپنائیت اور انسیت کا احساس ایسے مواقع پر ہوتا ہے شائد ہی

تنظیم اسلامی کے مرد کہستانی شمس الحق اعوان جو ناظم اجتماع تھے ــ انتظامات کی خوبی پر خراج تحسین حاصل کیا۔

انجینئر مختار حسین فاروقی نے دعوت کی ضرورت و اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا کہ انقلابی عمل کا آغاز کسی نظریہ کی طرف دعوت ہی سے ہوتا ہے لیکن وہ نظریہ انقلابی ہونا چاہئے جو نظام باطل پر تیشہ بن کر گرے۔

کسی اور طرح ہوتا ہو۔ تنظیم اسلامی کا سالانہ اجتماع جب اختتام پذیر ہوا اور رفقاء اپنے اپنے مساکن کی طرف جا رہے تھے تو اکثر کے چہرے افسردہ تھے' اس لئے کہ انہوں نے جو چند دن ایک مختلف قسم کی محبت واپنائیت کے ماحول میں گزارے تھے' ان کے اختتام کا انہیں شدید احساس تھا۔ مجھ سے ایک رفیق تنظیم جاتے ہوئے ملے تو کہنے لگے کہ نجانے اب پھر کب ملیں گے! یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک پڑیں۔ یہ محبت اللہ کے لئے ہے۔ یہاں یہ تاثر بھی نقل کر ہی دوں کہ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ تنظیم اسلامی کے رفقاء میں باہمی محبت جس درجے میں ہونی چاہئے وہ نہیں ہے۔ میرا اپنا بھی ایک عرصہ تک یہ

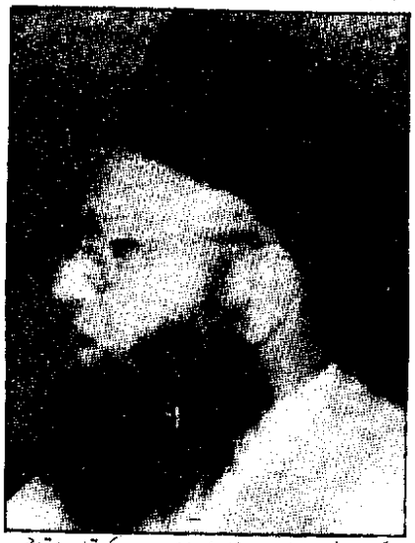

ڈاکٹر عبدالسمیع نے دعوت کا ہدف اقامت دین کو قرار دیا تھا جس پر امیر محترم نے اپنے صدارتی کلمات میں یہ اضافہ کیا کہ اقامت دین سے بھی اصل مقصود نجات اخروی اور حصول رضائے رب ہی ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر عارف رشید نے دعوت اور انبیاء کا طریق کار کے موضوع پر خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت سب سے پہلے معاشرے کے بااثر طبقات تک پہنچائی۔

جماعت کا تصور امیر محترم رکھتے ہیں وہ تو واقعتاً بننے میں ابھی وقت لگے گا تاہم تنظیم اسلامی کے رفقاء اب نظم کے خوگر ہوتے نظر آ رہے ہیں۔

نظم وضبط کے علاوہ ایک اور اہم بات انتظامات کی خوبی تھی۔ الحمدللہ کہ راقم نے جتنے سالانہ اجتماعات میں شرکت کی ان میں سے سب سے بہتر انتظامات اس اجتماع میں نظر آئے۔ رفقاء کو محترم شمس الحق اعوان صاحب نے' جن کے کاندھوں پر ناظم اجتماع کی ذمہ داری تھی' ہر سہولت مہیا کی۔ جس کے ذمے جو ڈیوٹی تھی اس نے بطریق احسن اسے نبھانے کی کوشش کی۔ اس حوالے سے ایک اپنا تاثر بیان کر رہا ہوں کہ انقلابی جماعت کے کارکنوں کو ایسی سہولتوں کا عادی نہیں بنانا چاہئے۔ اس کے برعکس ان کی تربیت کا ایک

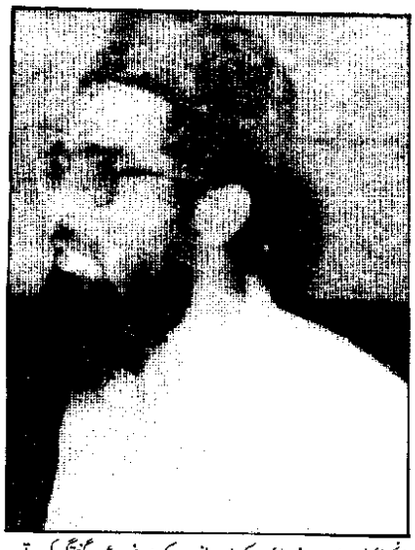

انجینئر نوید احمد نے داعی کے اوصاف کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ دعوت اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتی ہے جب تک داعی کا کردار اس کا آئینہ دار نہ ہو۔

تاثر تھا لیکن اس سالانہ اجتماع کے موقع پر میرا یہ تاثر ختم ہو گیا ہے۔

چوہدری رحمت اللہ بٹر نے یاد دلایا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی دعوت کو شروع ہی انذار سے کیا تھا چنانچہ اب ہمیں بھی فکر آخرت سے بھرپور کام لینا چاہئے۔ فکر آخرت ہی ہمارے لئے مہمیز کا کام کرے اور اپنے مخاطب میں بھی یہی فکر پیدا کر کے دعوت کی قبولیت کے لئے اسے تیار کیا جا سکتا ہے۔

اس سالانہ اجتماع کے موقع پر ایک اہم بات یہ سامنے آئی کہ نظم وضبط کا معیار گزشتہ اجتماعات سے بہت بہتر تھا۔ کسی بھی انقلابی جماعت کے کارکنوں میں نظم وضبط کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اسی لئے امیر محترم

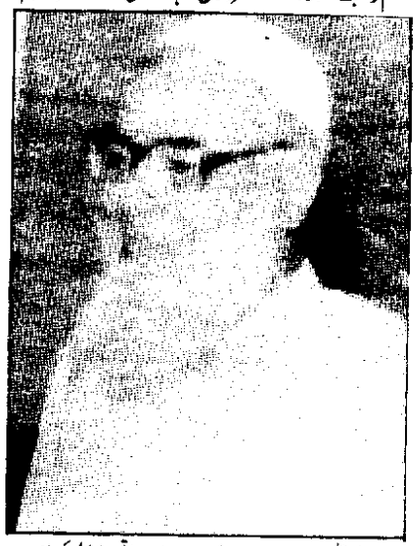

لطف الرحمٰن خان صاحب نے دعوت میں ذاتی رابطے کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ داعی خود دوسروں کے پاس چل کر جاتا ہے دوسرے اس کے پاس چل کر نہیں آتے اور یہ مسلسل کرنے کا کام ہے۔

مدظلہ کہا کرتے ہیں کہ میں تو ایک انقلابی جماعت بنانے کی کوشش کر رہا ہوں' کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ انقلابی جماعت بنائی جا چکی ہے۔ جس انقلابی

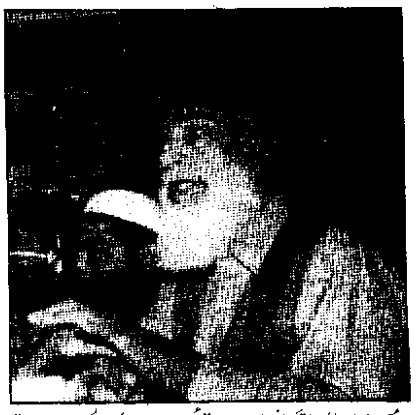

میجر جنرل ایم ایچ انصاری : "اگر ہمارے یہی چلن رہے تو پاکستان میں اسلام کا مستقبل مخدوش ہے۔"

پہلو یہ بھی ہونا چاہئے کہ مشکلات کا سامنا کریں کیونکہ ایک انقلابی جماعت کے کارکنوں کو کسی بھی وقت مصائب کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

تنظیم اسلامی پاکستان کا سالانہ اجتماع اس حوالے سے بھی گزشتہ اجتماعات سے مختلف تھا کہ میر کارواں کی شرکت بہت کم رہی۔ خطبہ جمعہ سے سالانہ اجتماع کا افتتاح ہوا' یہ خطبہ جمعہ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ امیر محترم کا معمول کا پروگرام تھا' اس کا سالانہ اجتماع سے زیادہ تعلق نہ تھا۔ اس کے بعد پھر اختتامی خطاب تھا۔ باقی تمام پروگرام تنظیم اسلامی کی دوسری صف نے انجام دیئے۔ اس سے یہ غلط فہمی کسی درجہ میں رفع ہوئی ہے کہ تنظیم اسلامی "ون مین شو" ہے۔ اس اجتماع کے موقع پر جس طرح دوسرے رفقاء نے تقاریر کیں ہیں' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب الحمدللہ امیر محترم کی فکر کو اچھی طرح سمجھنے والے اور پھر بیان کرنے کی صلاحیت رکھنے والے رفقاء کی کمی نہیں رہی۔

تنظیم اسلامی میں شمولیت سے قبل اور شامل ہونے کے بعد بھی ایک عرصہ تک راقم خود اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ تنظیم اسلامی امیر محترم کے دم قدم

مذاکرے کے میزبان اقتدار احمد : "ہمیں اسلام کے مستقبل کی نہیں' دراصل پاکستان کے مستقبل کی فکر ہے جو اسلام سے وابستہ ہے۔"

سے ہی قائم ہے اور ان کے بعد شائد اس کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے۔ میں اپنے اس اندیشے کا اظہار اپنے رفقاء سے کرتا رہا۔ ہمارے ایک محترم رفیق نے ایک دن فرمایا کہ جب تک امیر محترم مدظلہ موجود ہیں' دوسرے باصلاحیت لوگ بھی نمایاں نہیں ہو سکیں گے۔ انہوں نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ بڑی شخصیات

سید نسیم الدین : "مشیت ایزدی میں یقیناً یہ خطہ نظام خلافت کی بنیاد بنے گا۔"

کی موجودگی میں ان سے زیادہ صلاحیت والا آدمی ہی بہت زیادہ نمایاں ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تنظیم میں باصلاحیت لوگوں کی کمی ہے۔

یہی خدشہ میرے ایک دوست جو تنظیم اسلامی کی فکر سے بہت زیادہ متاثر تھے ظاہر کیا کرتے تھے کہ

وارث خان صاحب : "بیسویں صدی عیسوی اسلام کے فکری احیاء کی صدی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کے بعد کیا ہو گا؟۔ اس سالانہ اجتماع پر وہ موجود تھے اور الحمد للہ تنظیم اسلامی میں شمولیت بھی اختیار کر لی ہے۔ رفقاء کی مختلف موضوعات پر انہوں نے تقاریر سنی ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کا خدشہ دور ہوا ہے یا نہیں' تو کہنے لگے کہ بالکل رفع ہو گیا ہے۔

اس سالانہ اجتماع کے حوالے سے ایک اور اہم بات' جو راقم نے نوٹ کی' شائد دوسرے رفقاء کا ذہن

بھی اس طرف گیا ہو۔ یہ کہ فکری توازن کے معاملہ میں جہاں امیر محترم بہت حساس ہیں وہیں یہ کیفیت میں نے رفقاء میں بھی نوٹ کی ہے۔ چنانچہ جب رفیق محترم ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے دوران گفتگو اقامت دین کی اہمیت بہت زیادہ بیان کی اور دعوت کا ہدف اقامت دین کو قرار دیا اور ان کی گفتگو سے کچھ یہ مترشح ہوتا تھا کہ گویا اقامت دین نصب العین ہے تو اس بات کی امیر محترم مدظلہ نے فوراً وضاحت کی اور بڑے زور دار الفاظ میں کہا کہ ہمیں یہ چیز کسی وقت بھی نہیں بھولنی چاہئے کہ ہمارا نصب العین نجات اخروی اور حصول رضائے الٰہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اکثر تحریکیں اسی وجہ سے ناکام ہوئی ہیں کہ انہوں نے اپنے ہدف کا صحیح تعین نہیں کیا۔ ظاہر ہے جب نصب العین اسلامی انقلاب یا اقامت دین ٹھہرے گا اور اس

عبدالرزاق صاحب : "مذہبی سیاسی جماعتوں نے اپنی غلط پالیسی سے وطن عزیز کو نظام اسلام کی منزل کی طرف بڑھنے نہ دیا۔"

نصب العین کے حصول کے امکانات دور دور تک نظر نہ آئیں تو فرسٹریشن پیدا ہو گی اور اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے غلط صحیح ذرائع اور راستے اختیار کئے جائیں گے۔ لہٰذا امیر محترم کی وضاحت کے علاوہ قرآن کالج کے پرنسپل محترم لطف الرحمٰن خان صاحب نے بھی اپنے لیکچر میں بتایا کہ نصب العین کے غلط تعین کی وجہ سے "حب عاجلہ" کا روگ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ واقعتہً مقام شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فکری توازن سے نوازا ہے اور ہم دوسروں کے بڑے بڑے اجتماع دیکھ کر حب عاجلہ کا شکار نہیں ہوتے۔

اس سالانہ اجتماع کے پروگراموں میں ایک اہم پروگرام "مذاکرہ" کا تھا۔ مذاکرہ کا موضوع تھا "پاکستان میں اسلام کا مستقبل" اس پروگرام کی میزبانی اقتدار احمد صاحب کر رہے تھے۔ پاکستان اور اسلام کا آپس میں تعلق کیا ہے؟ یہ امیر محترم مدظلہ کا بہت اہم اور پسندیدہ موضوع ہے۔ اس پر امیر محترم نے لکھا بھی

ہے اور بلاشبہ بیسیوں تقاریر بھی کی ہیں۔ تنظیم اسلامی کے رفقاء امیر محترم کے افکار سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ امیر محترم کو اس خطہ سے جو توقعات وابستہ ہیں' وہ بھی سب پر عیاں ہیں۔ لیکن اس مذاکرہ میں جن رفقاء نے حصہ لیا ان میں سے اکثر نے اپنے اپنے نقطہ نظر کو بیان کیا' امیر محترم کے افکار کو من وعن بیان نہیں کر دیا۔ خصوصاً محترم جنرل انصاری مدظلہ اور محترم لطف الرحمٰن خان صاحب نے جو نقطہ نظر پیش کیا وہ ڈاکٹر صاحب کے افکار سے کسی قدر مختلف تھا۔

اس کی اہمیت راقم کے نزدیک یہ ہے کہ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ تنظیم اسلامی کی بنیاد بیعت سمع وطاعت پر ہے لہٰذا وہاں فکری آزادی نہیں ہے۔ تنظیم اسلامی کے وابستگان جانتے ہیں کہ جتنی فکری آزادی اور اظہار رائے کے مواقع تنظیم اسلامی میں ہیں' شائد ہی کسی دوسری جماعت میں ہوں۔ خصوصاً عمرانی و سیاسی افکار کے حوالے سے تو ڈاکٹر صاحب مدظلہ کبھی بھی یہ نہیں کہتے کہ رفقاء وہی رائے رکھیں جو میری ہے۔ جہاں تک تعلق ہے ان سیاسی امور کا جن کے بارے میں تنظیم اسلامی کی جماعتی پالیسی بن چکی ہے اور جن سے اتفاق کی صورت میں ہی تنظیم میں شمولیت ممکن ہے' ان سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا مثلاً تنظیم اسلامی انتخابی سیاست میں کبھی نہیں جائے گی' انتخابی سیاست سے انقلاب ممکن نہیں' تنظیم اسلامی کا رفیق الیکشن میں حصہ نہیں لے سکتا' تنظیم اسلامی نہ ہی بحیثیت جماعت اور نہ ہی اس کا کوئی رفیق کسی کے لئے الیکشن مہم چلائے گا۔ ووٹ دینے کے لئے دو شرائط ہیں' جس امیدوار میں یہ شرائط پوری ہوں اس کے حق میں ووٹ کاسٹ کرنے کی اجازت ہے۔ بہرحال رفقاء نے اس مذاکرے میں کھل کر اظہار خیال کیا اور اپنی رائے بیان کی۔

تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماعات میں عموماً فکری یاددہانی کا وافر سامان ہوتا ہے۔ خصوصاً کسی ایک موضوع پر مختلف تقاریر اور دروس کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ اس موضوع کے مختلف گوشے کھل کر سامنے آئیں۔ چنانچہ گزشتہ سالانہ اجتماع کا موضوع تھا "نظم جماعت" جس کے مختلف پہلوؤں پر رفقاء نے دروس دیئے۔ مثلاً امیر اور مامور کے آداب و فرائض' نجویٰ کی حقیقت' اجازت لینے کی شرائط و آداب وغیرہ وغیرہ۔ اس سال کا موضوع "دعوت" تھا چنانچہ تمام دروس اور لیکچر دعوت ہی کے مختلف پہلوؤں پر

(باقی صفحہ ۶ پر)

مبارک ہو!

یہ ناکامی ایک انتباہ بن سکتی ہے

عبداللہ

الیکشن ۹۳ء کے نتائج پر وابستگان جماعت اسلامی انگشت بدندان اور دل گرفتہ ضرور ہوں گے مگر ہم انہیں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ مبارکباد کی وجہ اور اپنی بات کو واضح کرنے کے لئے ایک واقعہ پیش خدمت ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے ضلع گجرات کے ایک نواحی گاؤں کے امام مسجد کا اکلوتا بیٹا شدید بیمار پڑ گیا۔ باوجود انتہائی علاج معالجہ کے مرض بڑھتا گیا اور زندگی کی امید ختم ہونے لگی۔ مولوی صاحب کے ہمسائے میں آباد ایک ہندو گھرانے کی عورت نے مولوی صاحب کی بیوی کو مشورہ دیا کہ بہن! تم فلاں پیپل کے درخت کے سات چکر لگا کر تھوڑا سا دودھ جڑوں میں ڈال آؤ' بھگوان جی کرپا سے تمہارا بچہ ضرور ٹھیک ہو جائے گا۔ بیوی نے مولوی صاحب سے ذکر کیا۔ مولانا پہلے تو بھڑک اٹھے کہ یہ کیا کفر و شرک کی باتیں کرتی ہو مگر بیوی بضد تھی کہ بچے کی جان بچانے کے لئے میں یہ کام ضرور کروں گی۔ مولوی صاحب نے سوچا کہ اگر کسی نے بیوی کو یہ حرکت کرتے دیکھ لیا تو بہت بدنامی ہو گی اس لئے خود ہی چادر لپیٹ کر نکلے اور یہ کام کر گزرے۔ ایک جاٹ نے مولوی کو چکر لگاتے دیکھ لیا اور پہچان گیا' آدمی کائیاں تھا فوراً بات کو سمجھ گیا مگر خاموش رہا۔

خدا کی قدرت کہ اسی رات بچہ چل بسا۔ اگلے روز قرب و جوار سے علماء کرام اور عوام اظہار افسوس کے لئے آنا شروع ہو گئے۔ قریبی گاؤں کے ایک مولانا اسی غرض سے آ رہے تھے کہ مذکورہ جاٹ سے ملاقات ہو گئی۔ جاٹ نے سارا واقعہ بیان کر دیا اور کہا کہ اپنے مولوی کا کردار دیکھیں۔ مولانا صاحب افسوس کے لئے مولوی کے گھر پہنچے تو سب لوگوں کے سامنے ہی مولوی کو مبارک باد پیش کی۔ مولوی کو بات ناگوار گزری اور بولا کہ مولانا میرا بیٹا مر گیا ہے اور آپ کو مبارک سوجھ رہی ہے۔ مولانا نے فرمایا "مولوی' تمہارے گھر میں کفر کا جو پودا اگنے والا تھا' اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اسے فوراً ہی ختم کر دیا ہے اس لئے مبارک ہو۔ اگر آج تمہارا بچہ ٹھیک ہو جاتا تو تم اس کی شفایابی کا باعث اپنی اس کفریہ حرکت کو سمجھتے' تمہارا ایمان خدا سے زیادہ پیپل کے درخت پر ہو جاتا' تمہارا گھر کفر کا قلعہ بن جاتا اور اس گاؤں سے اسلام کا جنازہ تم نکال دیتے"۔

بالکل یہی کچھ جماعت کے ساتھ ہوا ہے۔ اگر انتخابات میں اسلامی فرنٹ کو کامیابی نصیب ہو جاتی تو قاضی صاحب اور جماعت کے دوسرے احباب یہی سمجھتے کہ یہ اسلامی فرنٹ کی اس عوامی طرز کی انتخابی مہم کا ثمر ہے جس میں باجے گاجے' گانے' ترانے' ڈھول تاشے' بھنگڑے' ناچ اور گالی گلوچ سب کچھ دوسروں سے بڑھ کر استعمال ہوئے تھے۔ اور آئندہ کے لئے یہ سب کچھ "تحریک" کے لئے لازمی قرار پاتا جبکہ ان سب حرکات کو عین اسلام ثابت کرنے کے لئے اور اسلام کو "عوامی" بنانے کے لئے جو حربے استعمال ہوئے اہل درد کے لئے ان کا تصور ہی نیند اڑانے کو کافی ہے۔

لوگ تو اب بھی کہتے ہیں کہ اصل اسلام تو قاضی صاحب نے دکھلایا ہے۔ اب تو میوزک اور ناچ گانا توشہ آخرت اور متاع دین ہو گا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ رب العزت کا خاص فضل ہوا ہے جو اسلامی فرنٹ کی عوامی اسلام پر مبنی "پاسبانی" انتخابی تحریک کا ڈراپ سین پہلے ہی مرحلے میں ہو گیا ہے۔ نتائج کو دیکھ کر ان شاء اللہ آئندہ کوئی بھی دینی جماعت ایسی غلطی نہیں کرے گی۔ لہٰذا اب کارکنان جماعت اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی سابقہ روش پر توبہ واستغفار کے ساتھ ساتھ آئندہ کے لئے اس انتخابی سیاست سے کنارہ کش ہونے کا تہیہ کر لیں اور اپنی پرانی گم کردہ اور اصل انقلابی تحریک کو اجاگر کریں۔

گو دینی جماعتوں کا کام کچھ مشکل ضرور ہو گیا ہے اور قاضی صاحب کی "حرکات" کا جواب ہر دینی کارکن کو دینا پڑے گا مگر ان شاء اللہ جلد ہی لوگ پھر اپنا سرمایہ جان دین کے کام کے لئے پیش کرنا شروع کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ اس ارض پاک میں اپنے دین کا غلبہ ضرور فرمائے گا۔ ان شاء اللہ ○○

سندھ کے یہ مسلمان دانشور

الٹی سمجھ کسی کو بھی ایسی خدا نہ دے

محمد رمضان پھلپوٹہ

چند روز ہوئے ایک سندھی اخبار میں سندھی قوم پرست اور کمیونسٹ رہنما' رسول بخش پلیجو صاحب کا ایک طویل مضمون "پاکستان میں جمہوریت کے پاؤں مضبوط کیوں نہیں ہوتے؟" شائع ہوا ہے جس میں پلیجو صاحب نے جمہوریت کی ناکامی میں دوسرے اسباب کے ساتھ اسلام' روحانیت اور دیندار طبقے اور بقول پلیجو صاحب ملا شاہی کو بھی شمار کیا بلکہ سرفہرست رکھا ہے لکھتے ہیں :"مسلمانوں کی اکثریت نے انگریزی تعلیم پڑھنے کو عار سمجھا۔ تنگ نظر ملاؤں نے کہا کہ انگریزی پڑھنا گناہ ہے اس لئے ہندوستانی مسلمان عوام اپنے رجعت پسند عوام دشمن جاگیردار طبقے اور تنگ نظر ملا شاہی کی لیڈر شپ اور دباؤ کے تحت وڈیرانہ' سرداری' پیرانہ' میرانہ جاگیردارانہ اور ملا شاہی سامراجی اور روحانی آمریت کے تاریک سمندر میں غرق ہوگیا"۔

یہ ہے مضمون کا صرف ایک مختصر اقتباس جس میں موصوف نے کم ازکم تین مرتبہ علماء کرام اور اسلامی ذہنیت رکھنے والے طبقے پر اپنی بھڑاس نکالی اور روحانیت یعنی اسلام اور علماء کرام پر بے جا تنقید کی ہے۔ سارا مضمون اسی نوعیت کے زہر آلود جملوں سے اٹا پڑا ہے۔ اس لئے ہم اس مضمون میں بالترتیب ان تین باتوں کا یعنی (1) اسلام (2) روحانیت اور (3) علماء کرام کے کردار کا مختصر جائزہ لیں گے۔

اسلام :۔ پلیجو صاحب کی اکثر تحریروں کی طرح ان کے اس مضمون سے بھی اسلام دشمنی ٹپک رہی ہے۔ علماء کرام پر تنقید کا اصل سبب بھی اسلام ہی ہے کہ یہ علماء کرام ہی ہیں جو اسلام کے خلاف اٹھنے والے ہر فتنے کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے موصوف کو اسلام اور اسلام والوں (دیندار طبقے) سے خدا واسطے کا بیر ہے ورنہ کہاں پاکستان میں جمہوریت کا نہ پنپنا اور کہاں اسلام اور روحانیت۔ ع ایسی سمجھ کسی کو بھی ایسے خدا نہ دے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام صرف روزہ نماز اور چند مذہبی رسوم کا نام نہیں ہے اور نہ ہی عیسائیت کی طرح فرد کا ذاتی مسئلہ ہے بلکہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ جس میں زمانے کے بدلتے ہوئے گوناگوں حالات سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت اور قوت ہے۔ اسلام انسان کی نجی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک پیش آنے والے ہر مسئلہ کا بہتر نمونے سے حل پیش کرتا ہے۔

آج سے چودہ سو سال قبل فاران کی چوٹیوں سے چمکنے والا بنی نوع انسان کی مکمل فلاح اور نجات والا پیغام آج بیسویں اور اکیسویں صدی میں بھی دنیا کی قیادت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آج دنیا کے الجھے ہوئے مسائل کا حل نہ تو امریکہ کا سرمائیدارانہ نظام دے سکتا ہے نہ ہی روس کا کیونسٹ نظام۔ ہم اپنے اس دعویٰ کو دو طریقوں سے ثابت کر سکتے ہیں۔ اولاً قرآن' حدیث اور اسلامی فقہ سے ثابت کرنا کہ دنیا کے سارے نظاموں میں سے صرف اسلام ہی بنی نوع انسان کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت کس طرح رکھتا ہے جب کہ انہی مسائل میں امریکی اور روسی نظام بالکل ناکام ہوئے ہیں اور ثانیاً دنیا کے بڑے بڑے غیر مسلم مفکروں' دانشوروں اور سنجیدہ افراد نے بھی تسلیم کیا ہے کہ اسلام ہی وہ واحد نظام ہے جو ہر زمانے کی ضروریات سے ہم آہنگی رکھتا ہے۔ یہ اخباری مضمون تو اتنے سارے علمی بحث کی گنجائش نہیں رکھتا چنانچہ یہاں صرف آخری بات کو مختصر طور پر ثابت کرتے ہیں جب کہ پہلے قسم کے علمی اور سائنٹیفک مضمون کو خود راقم نے بھی اپنی کتاب "اسلام اور جدید سائنس" میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

انگلستان کا مشہور مفکر جارج برنارڈ شا اپنی کتاب "محمد ﷺ اللہ کے نبی" میں رقمطراز ہے کہ "میں ہمیشہ اسلام کی عزت واحترام کا قائل رہا ہوں۔ میری نظر میں صرف اسلام ہی وہ تنہا مذہب ہے جو زندگی کی بدلتی ہوئی تصویروں کا ساتھ دے سکتا ہے اور جو مختلف قرنوں میں گوناگوں حالات کے مقابلے کی استعداد رکھتا ہے۔ میں آج ہی سے پیش گوئی کر رہا ہوں کہ ابھی سے اس بات کے آثار پیدا ہو چکے ہیں جن کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کل کا مغرب پورا کا پورا مسلمان ہو گا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بشریت کا نجات دہندہ صرف اور صرف یہی دین ہو سکتا ہے" اور آگے تحریر کرتا ہے :

"If a man like Muhammad (P.B.U.H) were to assume the dictatorship of the modern world, he would solve its problems in a way that would bring it much needed peace and happiness."

یعنی اگر محمد ﷺ جیسا کوئی آدمی موجودہ دنیا کا قائد ہو جائے تو وہ اس کے مسائل کو اس طرح حل کر دے گا کہ دنیا میں وہ امن اور خوشی قائم ہو جائے جس کی ہمیں بہت زیادہ ضرورت ہے۔

برصغیر کا قد آور سیاسی رہنما مہاتما گاندھی کہتا ہے "اسلام اپنے عروج والے دور میں بھی رواداری کا مذہب رہا ہے بلکہ اس وقت ساری دنیا اس کی مدح سرائی کرتی رہی ہے۔ اس وقت جب کہ سارا یورپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا' مشرقی افق سے ایک ستارہ روشن ہوا جس نے بے آرام دنیا کو روشنی' امن اور راحت کا پیغام بہم پہنچایا۔ ہندوؤں کو چاہئے کہ وہ اس کا مطالعہ کریں جیسا کہ میں نے مطالعہ کیا ہے۔ پھر وہ مجھ جیسے اسلام سے محبت کرنے لگیں گے"۔

سر فلپ گبز اپنی کتاب "محمد ﷺ کی مدح" میں لکھتا ہے کہ :

"Islam as the religion of Muhammad (Peace be upon him) is properly called, has done for the forward progress of civilization and morality than any other faith which has animated the souls of men since the beginning of creation."

یعنی اسلام جیسا کہ محمد ﷺ کا دین کہلاتا ہے' نے انسانی تہذیب اور اخلاقی ترقی کے لئے ان سارے مذاہب سے بڑھ چڑھ کر کام کیا ہے' جو انسان کی پیدائش سے لے کر آج تک اس کی روح کو ولولہ عطا کرنے کا باعث بنے ہیں۔

روحانیت :۔ انسان مادی لحاظ سے چاہے کتنی بھی ترقی کر کے اپنے عیش وعشرت کا سامان تیار کر لے لیکن اس کو کبھی بھی اندرونی سکون اور آرام میسر نہیں ہو سکتا۔ آج یورپ مادیت سے روحانیت کی طرف واپس لوٹ رہا ہے۔ روحانیت دوسرے الفاظ

میں مذہب کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ کناڈا کا ایک شخص اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان میں اقامت پذیر ہوا تھا۔ اس شخص کو وہاں اپنی ذاتی کار' ایک بنگلہ اور زندگی کی دوسری سہولتیں میسر تھیں اور ہندوستان میں ان سہولتوں سے محروم تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ جناب! آپ اپنے ملک کا عیش و عشرت چھوڑ کر یہاں کیسے آئے ہیں تو اس نے جواب دیا :

"There I was comfortable physically, here I am comfortable spiritually."

یعنی وہاں میں جسمانی طور پر مطمئن تھا' یہاں میں روحانی طور پر مطمئن ہوں۔

نیویارک کے اکیڈمی آف سائنس کے صدر ای ۔ کریسی مارسین اپنی کتاب

"Man does not stand alone"

میں لکھتا ہے کہ "الحاد و مادہ پرستی سے کبھی بھی ادب' احترام' سخاوت' کردار کی بلندی' اخلاقی ہمدردی' نیکی اور اعلیٰ اخلاق پیدا ہو نہیں سکتے۔ یہ سب خدائی صفات ہیں۔ ایک منکر شخص اپنے آپ کو خدا کی جگہ پر تصور کرتا ہے۔ مذہب (روحانیت) عقیدے اور یقین کے سوا تہذیب تباہ و برباد ہو جائیگی' نظم ختم ہو جائیگا' انسان کے لئے اپنے نفس پر کنٹرول کرنا ممکن نہیں رہے گا اور چاروں طرف برائی پھیل جائے گی۔ سخت ضرورت ہے کہ ہم خدا پر اپنا یقین دوبارہ مضبوط کریں" لارڈ مارلے نے کہا تھا :

"The next great task of science is to create a religion for mankind."

یعنی سائنس کا دوسرا سب سے اہم کام یہ ہے کہ انسان ذات کے لئے ایک مذہب تخلیق کرے۔ اگرچہ مذہب سے اس کی مراد اسلام نہیں ہے۔ لیکن ایک ایسی چیز ضرور ہے جو مادہ اور نفس کے علاوہ دوسری چیز ہو جس کا نام ہے روح یا روحانیت ہے۔

علاماء کرام کا کردار :۔ ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ اپنے آپ کو ترقی پسند ادیب کہلانے والا پلیجو حقیقت سے آنکھیں بند کر کے علماء کرام کو وڈیروں' سرداروں' پیروں اور جاگیرداروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے حالانکہ یہاں کے علماء کرام اور دیندار طبقے نے گورے سامراج' ان کی بوٹ پالش کرنے والے حکمرانوں' سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف ہمیشہ حق و صداقت کا آواز بلند کیا ہے۔ انگریز سامراج جب ہندوستان میں داخل ہوا تو اس کے خلاف یہاں کے عوام کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں علماء کرام نے اہم رول ادا کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کس نے لڑی؟ شاملی محاذ پر لڑنے والے مولانا رشید احمد گنگوہی' حافظ ضامن شہید اور دوسرے سینکڑوں مجاہدین مسلمان ہی تھے۔ بالاکوٹ کے میدان کارزار میں کودنے والے سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید اسی گروہ کا تسلسل تھا۔ تحریک آزادی کے سلسلے میں علماء کرام کی خدمات کو تاریخ سلام پیش کر چکی ہے۔ جس کانگریس کی تعریف میں پلیجو صاحب رطب اللسان ہیں' اسی کانگریس کا مسلسل سات سال تک صدر رہنے والے امام الہند ابو الکلام آزاد تو تھے ہی مولانا۔ ہمارے نزدیک برصغیر کا کوئی بھی رہنما بشمول گاندھی جی ایسا نہیں جو تحریک آزادی' انسان ذات کی خیر خواہی وغیرہ میں مولانا ابو الکلام آزاد کا ہم پلہ ہو سکے۔ پلیجو صاحب کا پہلا فکری مرشد جی۔ ایم سید اپنی کتاب "جدید سیاست کے نورتن" میں لکھتا ہے' "میرے خیال میں ان صفات کا یکساں ماہر ہندوستان میں ابھی تک کوئی بھی پیدا نہیں ہو سکا ہے"۔

سامراج دشمن جذبے سے سرشار مالٹا جیل کے دو اسیروں شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا حسین احمد مدنی کے کردار کو بھی تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہے۔ جمعیہ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے سینکڑوں علماء کرام اور اسلامی ذہنیت رکھنے والے نوجوان طبقے نے انگریز سامراج اور غیروں کی ہندوستان پر یلغار کے خلاف بڑی گرمجوشی سے تحریک چلائی۔

پلیجو صاحب نے لکھا ہے کہ "علماء نے انگریزی پڑھنے کو گناہ قرار دیا"۔ یہی بات تو ان علماء کے سامراج دشمن جذبے اور غیروں کو اپنے ملک سے دھکیل کر واپس کرنے کے مصمم ارادے کی دلیل ہے۔ جس نصاب تعلیم کا مقصد صرف سامراج کے لئے زیادہ سے زیادہ منشی اور کلرک فراہم کرنا ہو' اس کی مخالفت کرنا کیا گناہ تھا؟ اگر آج کوئی قوم پرست "سندھی لکھو' سندھی پڑھو" کے نعرے کو تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے تو کیا اس وقت سامراج کے پاؤں اکھیڑنے کے لئے اس کی زبان' کلچر' ثقافت اور رہن سہن کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے میں علماء کرام حق بجانب نہیں تھے؟ ہمیں تو فخر ہے کہ علماء کرام نے انگریز فوج میں بھرتی ہونے کو حرام قرار دیا اور انگریزوں کے سوشل بائیکاٹ کی تحریک چلائی۔

سندھ کے علماء کرام نے تحریک ہجرت' تحریک خلافت' تحریک ترک موالات وغیرہ چلا کر سامراج دشمنی کا ثبوت بہم فراہم کیا۔ خود پلیجو صاحب ایشیا کے ماڈل ڈکٹیٹر جنرل ضیاء کے خلاف ایم۔ آر۔ ڈی کے پلیٹ فارم سے علماء کرام کی قیادت میں حصہ لے چکے ہیں۔ علماء کرام کے کردار کے سلسلے میں آپ کے ذہن کو تازہ کرنے کے لئے صرف ان اشارات و کنایات پر اکتفا کی جاتی ہے ورنہ ان کی شاندار ماضی پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ OO

بقیہ تفکر و تذکر

کر کے اب آخری اقدام کے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور دوسرے صاحب نے اس بار "قاضی آ رہا ہے!" کا غلغلہ اس زور شور سے بلند کیا کہ میرانیس اور دبیر کے مرثیوں کی یاد تازہ ہو گئی کہ ۔ "کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے۔ رستم کا بدن زیر کفن کانپ رہا ہے!" ---- اور اس لئے بھی کہ میں نے بحمد اللہ نہ آج تک یہ قلابازی کھائی ہے کہ لاہور کی دیواروں کو "سرمایہ داروں اور جاگیرداروں" کے خلاف نعروں سے سیاہ کرنے کے بعد ان ہی کے ساتھ مل کر آئی جے آئی بنالی ہو' نہ یہ کہ انتخابات میں زور شور اور آن بان کے ساتھ حصہ لے کر چاروں شانے چت ہو جانے کے بعد' اور بعض حضرات کے بقول اس بنا پر کہ "امیدوار" ہی دستیاب نہ ہو رہے ہوں اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا ہو ------ اس کے برعکس میں اپنی شعوری زندگی کے آغاز سے آج تک ایک ہی راستہ پر گامزن ہوں اور اپنی سب سے بڑی کامیابی اس کو سمجھتا ہوں کہ اسی راستہ پر چلتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کر دوں' وذالک ھوالفوز العظیم!!

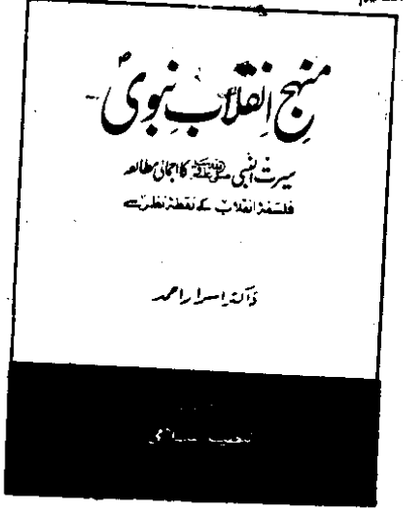

اشاعت خاص/۱۰۰ روپے ، عام/۱۲۰ روپے

کردہ عنایت نامہ تقریباً دو ہفتے قبل موصول ہوا تھا' لیکن میری نالائقی کہ میں آپ کے نوازش نامے کا بروقت جواب نہ دے سکا۔ امید ہے درگزر فرمائیں گے۔ جوابی خط میں تاخیر کا سبب دراصل انتخابات کی گہما گہمی تھا۔

آپ کے تینوں رسائل اعزازی طور پر ارسال ہونا شروع ہو چکے ہیں آپ کی بڑی نوازش۔ امید ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

حالیہ انتخابات میں جماعت اسلامی کی پوزیشن دیکھ کر دل بہت دکھا ہے اور بہت دنوں تک دکھے گا۔ رات بھر نیند نہیں آئی اور کئی راتیں اسی طرح گذریں گی۔ بے حد مایوسی ہوئی ہے اور اب یہ یقین ہو چلا ہے کہ موجودہ طریق انتخاب سے دینی قوتوں کو کبھی پذیرائی حاصل نہیں ہو سکے گی۔ اب کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ کیا کروں۔ بہت مایوس ہوں۔ اب دین کا کام کرنے کے لئے آپ مجھے پروگرام دیں کہ جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم اور طریق کار سے ہٹ کر دین کی سربلندی کے لئے جدوجہد کا کیسا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اب نہ صرف میں بلکہ میرے ساتھ چند اور احباب کا دل بھی جماعت اسلامی کے طریق کار اور اس کے سیاسی کاموں سے بالکل بیزار ہو چکا ہے۔ اب دل چاہتا ہے کہ تمام سیاسی کاموں کو چھوڑ کر دعوت و تبلیغ کا کام کیا جائے کیونکہ جماعت اسلامی میں اب سیاست غالب آ گئی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔

مجھے آپ کے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا۔ احباب کی خدمت میں سلام مسنونہ اور ہر طرح کی خیریت ہے۔ خدا کرے آپ بھی خیریت سے ہوں۔

امید ہے جواب جلد عنایت کریں گے۔

والسلام

نیازمند

محمود عالم بھٹو

گوٹھ جندو دیرو ضلع شکارپور سندھ

محترم بھائی محمود عالم بھٹو صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ ------ مزاج گرامی!

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۰ / اکتوبر موصول ہوا۔

انتخابات میں دینی عناصر خصوصاً اسلامی فرنٹ کے حوالے سے جماعت اسلامی کی ناکامی نے واقعتاً ہر اس پاکستانی کو صدمہ پہونچایا جس کے دل میں اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام کے لئے تڑپ موجود ہے اور ان لوگوں کے لئے تو یہ صدمہ دوچند ہو جاتا ہے جو کسی نہ کسی طور اس مقصد کے حصول کی عملی جدوجہد میں شریک ہوں۔ لہٰذا آپ کے احساسات کا ہمیں بخوبی اندازہ ہے بلکہ ہم خود اس صدمہ سے دوچار ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ یہ سارا ہمارا اپنا ہی کیا دھرا ہے ع اے بادصبا ایں ہمہ آوردہ تست۔

جماعت اسلامی کی عجلت پسندی کا امیر تنظیم اسلامی کو اللہ تعالیٰ کے فضل خاص سے اندازہ ہو گیا تھا اور یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ جماعت کے ایک نوجوان رکن تھے۔ بحیثیت رکن جماعت انہوں نے ۵۶ء میں ایک بیان اس وقت کی جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا جو اب "تحریک جماعت اسلامی۔ ایک تحقیقی مطالعہ" نامی کتاب کی صورت میں موجود ہے۔ ہمارا یہ پختہ یقین ہے کہ وطن عزیز میں موجودہ نظام انتخابات کے ذریعہ اسلامی انقلاب کی جانب کوئی پیش قدمی ممکن نہیں۔ یہ تو اسی طریق پر ممکن ہے جن کے نقوش ہمیں سیرت نبوی علی صاحب الصلوٰۃ والسلام میں نظر آتے ہیں۔

آپ نے مجھ سے پروگرام مانگا ہے کہ جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے ہٹ کر دین کی سربلندی کے لئے کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے تو بھائی محمود عالم بھٹو صاحب ارشاد نبوی ﷺ کے مطابق کہ جو بات تم اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی اپنے بھائی کے لئے بھی پسند کرو' مجھے تو وہی طریقہ کار پسند ہے جو ہمیں اسوۂ حسنہ میں ملتا ہے۔ اسی لئے میں ہمیشہ اپنے طریقہ کار پر چلنے کی دعوت اپنے دوستوں کو بھی دیتا ہوں اور اب آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ طریقہ کار چھ مراحل پر مشتمل ہے۔ (۱) دعوت (۲) تنظیم سمع و طاعت پر مبنی (۳) تربیت (۴) صبر محض (۵) اقدام (۶) مسلح تصادم۔

پہلے چار مرحلے حیات نبوی ﷺ کے مکی دور سے اخذ کئے گئے ہیں جبکہ بقیہ دو مراحل مدنی دور سے۔ امیر تنظیم اسلامی کی کتاب "منہج انقلاب نبوی۔ فلسفہ انقلاب کے نقطۂ نظر سے" میں تمام تفصیلات موجود ہیں۔ عوام اور حکومت کے درمیان اسلحوں اور نفری کے نسبت و تناسب کی لامحدودیت کی بناء پر مسلح تصادم کا مرحلہ ناگزیر حالات میں پیش آنے کا امکان ہے البتہ اس کے نعم البدل کے طور پر وہ طریقے استعمال کئے جا سکتے ہیں جو عصر حاضر میں مہذب دنیا میں رائج ہیں مثلاً پرامن مظاہرے' گھیراؤ (جلاؤ نہیں) اور پکٹنگ وغیرہ۔

برادرم! ہمیں تو اللہ کے دین کی نصرت کے لئے کام کرتے رہنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم پر لازم ہے کہ ہم اس جماعت کی طرف رجوع کریں جو سنت نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہو۔ ہم اس خط کے ہمراہ مذکورہ کتب اور نظام العمل روانہ کر رہے ہیں۔ ان کے مطالعہ کے بعد اگر آپ کا دل اس طریقہ کار پر ٹھکتا ہو تو بسم اللہ کریں۔ منسلک کوائف فارم اور بیعت فارم پر کر کے ہمیں روانہ فرما دیں۔ آپ کی آسانی کے لیے ہم اضافی کوائف فارم بھیج رہے ہیں تاکہ آپ اپنے احباب کو بھی اس کی دعوت دے سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

والسلام مع الاکرام

آپ کا دینی بھائی

محمد نسیم الدین

ناظم حلقہ سندھ و بلوچستان

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

استحکام پاکستان

اشاعت خاص ۵۰ روپے

اشاعت عام ۳۵ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن فون: ۸۵۲۶۱۱

پاکستان کیوں بنا ـــــ کیسے بنا

پاکستان کیوں ٹوٹا ـــــ کیسے ٹوٹا

اب ٹوٹا تو ---------

پاکستان کی تاریخ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ

اندھیروں میں اُمید کی ایک کرن

لفظ لفظ میں ـــ وطن کی محبت

سطر سطر میں ـــ ایمان کی پاشنی

عمل کا پیغام ---------

اس کتاب کا مطالعہ خود بھی کیجئے اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کیجئے

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

انجمن خدام القرآن سندھ کے زیر اہتمام

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے

خطباتِ خلافت

کے انعقاد کا ترمیم شدہ نظام الاوقات حسب ذیل ہے

بمقام : خالق دیناہال۔ بندر روڈ کراچی

بتاریخ : ۲۲ تا ۲۵ نومبر (چار روزہ)

بوقت : ۸ بجے شب (بعد نماز عشاء) روزانہ

نوٹ : (۱) ۲۵ نومبر کی مجلس اشکالات و سوالات کے جوابات کے لئے مخصوص ہوگی۔

(۲) خواتین کی نشست کا باپردہ انتظام ہوگا۔

تفاصیل فون نمبر ۵۸۵۴۰۳۶/۵۸۵۵۲۱۹ (اکیڈمی)

اور ۲۱۶۵۸۶/۲۶۲۰۴۹۶ (سٹی آفس) سے معلوم کی جاسکتی ہیں